206

کچھ زر کی بابت

از

ابو سالم ایم، اے (علیگ)

لکچرر شعبۂ معاشیات، مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ

پبلشرز

انجمن ترقی اُرْدُو (ہند) علی گڈھ

بار اوّل جنوری ۱۹۵۲ء

قیمت غیر مجلّد چاؔر رُوپے۔ مجلّد چاؔر رُوپے آٹھ آنے

طباعت زیر اہتمام

دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

فہرست

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پہلا باب

تمہید

زر یا روپیہ کیا ہے؟ روپئے کی تعریف کرنا خاصا دشوار کام ہے، حالانکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ روپئے کا کام کیا ہے۔ چاندی کے اس روپئے کو بھی ہم روپیہ کہتے ہیں جس پر ایک طرف "ایک روپیہ" لکھا ہوتا ہے، اور کاغذ کے ان پرچوں کو بھی جن پر چھپا ہوا ہوتا ہے "میں وعدہ کرتا ہوں کہ حامل ہذا کو پانچ (یا دس وغیرہ) روپئے ادا کر دوں گا"، اور نیچے گورنر ریزرو بینک کے دستخط ہوتے ہیں۔ اب سے کچھ زمانہ پہلے چاندی کے روپئے میں جتنی چاندی ہوتی ہے اس کی قیمت اتنی ہی ہوتی تھی، ابھی تھوڑے ہی دن پہلے تک ہمارے روپیہ میں کوئی دس آنے بھر کی چاندی ہوتی تھی لیکن اب چاندی کی مقدار اتنی گھٹ گئی ہے کہ روپیہ گلا کر بیچئے تو بجز ندامت (اور سزا) کے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ تو روپیہ کون سا ہے؟ چاندی کا وہ روپیہ جس میں بھرپور چاندی ہوتی تھی، یا روپے والے نوٹ جن پر کوئی بھی وعدہ نہیں لکھا ہوتا، یا پانچ اور اس سے بڑی رقموں کے نوٹ جن پر اتنے روپے دینے کا وعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے؟

روپے کی حقیقت سمجھنے کے لئے اگر اس کے تاریخی ارتقاء کا سہارا لیا جائے تو ہمارا کام نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ ارتقاء کی یہ داستان کچھ حد تک تو تصور کی

مدد سے ترتیب پائی ہے، کچھ ماہرین نے تاریخی حوالوں سے بتائی ہے۔ سب سے
پہلے تو ظاہر ہے روپے کی ایجاد کا سوال ہی سامنے آتا ہے۔ اس بارے میں ایک
نظریہ تو یہ ہے کہ روپیہ یا زر دراصل کسی چیز کا نام نہیں تھا، اور روپے کی ایجاد
دراصل ایک خیال کی حیثیت سے ہوئی۔ اس رائے کے ماننے والوں کا کہنا ہے
کہ پرانے زمانہ میں جب روپئے کا ابھی وجود نہیں تھا اور لوگ ایک چیز کے بدلے
میں دوسری چیز خریدتے اور بیچتے تھے، چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ ادل
بدل نہیں ہوتی ہوں گی۔ دھیرے دھیرے یہ قیمتیں رواجی قیمتیں بن جاتی
ہوں گی۔ مثلاً ایک گائے کے بدلے میں دس سیر گیہوں، اور دس سیر گیہوں کے بدلے
میں ایک بیل وغیرہ۔ اگر کسی خاص جگہ لوگوں کے لئے سب سے اہم چیز اناج ہو، تو
پھر یہ لوگ ہر چیز کی قیمت کو اناج کی ہی مدد سے طے کرنے لگے ہوں گے، گائے
دس سیر گیہوں میں ملے گی، اور اتنے ہی گیہوں کے بدلے میں دو بیل۔ اگر کسی کو یہ یاد
نہ رہے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب یاد رکھنا خاصا دشوار کام ہوگا کہ ایک سیر دودھ
کتنا انار دینے کے بعد حاصل ہوگا، اور چار بینگن کے لئے کتنا کاشی پھل دینا ہوگا۔
تو وہ ان سب چیزوں کا دام اناج کے مقابلے میں معلوم کر لیتا ہوگا اور اس طرح ان
مختلف چیزوں کی باہمی قیمت کا اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہوگا۔ اس طریقے سے جو
سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں ان کا اندازہ مشکل نہیں، پھر بھی ایک مثال سے اس کے
فوائد کا بیان کر دینا مفید ہوگا۔ ایک آدمی مر گیا اور اب اُس کے وارثوں میں
اُس کی جائداد کے بٹنے کا معاملہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اس شخص کے
پاس ایک گائے

ہیں۔ ظاہر ہے گائے اور بکرے کے ٹکڑے کر کے انہیں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بکرا ایک آدمی کو دیدیا جائے گائے ایک دوسرے کو اور باقی دونوں کو اناج میں سے بکرے اور گائے میں ان کے حصے کے مساوی مزید اناج تو یہ قصہ آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔ اس مثال سے ایک بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح اگر حساب کتاب کرنے، مختلف چیزوں کی قیمت کا اندازہ کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد ہو جائے تو چیزوں کی لین دین میں بھی سہولت ہو جائے گی جیسے اس قصے میں گائے اور بکرے کے بدلے میں اناج دینے سے وراثت کا جھگڑا ختم ہو گیا ویسے ہی اگر گائے اور بکرے کا آپس میں مبادلہ کرنا ہو تو بھی یہ طریق کار مددگار ہو سکتا تھا۔

بعض مصنفین نے بتایا ہے کہ آج بھی کچھ پس ماندہ علاقوں میں مختلف چیزوں کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے کسی ایک چیز کا استعمال عام ہے، اور دراصل یہ کسی "چیز" کا نہیں، بلکہ ایک خیال کا استعمال ہوتا ہے۔ کینس نے لکھا ہے کہ انھیں یوگنڈا کے ایک عہدہ دار نے بتایا کہ ایک قبیلے میں لوگ بکرے کو مختلف چیزوں کے دام کے ناپ یا پیمانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے بکرے بکرے میں فرق ہوتا ہے، تو ان عہدہ دار کے فرائض میں سے ایک یہ کام بھی ہے کہ یہ بتائیں کہ بکرا (جب کبھی اختلاف رائے کی نوبت آجائے) "معیاری" ہے یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، بکرے سے جو کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے ایک "معیار" یا ایک خیال کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس معیار یا خیال کی مدد سے قیمتوں کا تعین کیا جاتا ہے، جیسے ایک انچ، ایک فٹ کی مدد سے ہم فاصلہ ناپتے ہیں۔

لیکن ارنج اور رفٹ محض ایک خیال کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی کوئی مادی حیثیت نہیں
اس نقطہ خیال کی تائید میں کہ روپیہ یا زر دراصل محض ایک خیال کا نام، ایک پیمانے کا جس کا کوئی مادی وجود نہیں، بعض دلیلیں بھی ہیں۔ اس طرح مبادلہ میں بڑی آسانی ہو گئی ہوگی۔ لوگوں کو ظاہر ہے بہت چیزوں کی باہمی قیمتیں یاد رکھنے میں جو دقت ہوتی تھی وہ اس طرح دور ہو گئی ہوگی۔ پھر اس نظریہ کی مخالفت میں کوئی شہادت ہمیں تاریخ سے نہیں ملتی اس لئے ممکن ہے ایسا ہی ہوا بھی ہو۔ لیکن اکثریت کا خیال یہ ہے کہ زر کی ایجاد اس طرح نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں زر کی ایجاد اس طرح ہوئی کہ دھیرے دھیرے کوئی ایک چیز جسے اُس وقت کی زندگی میں خاص اہمیت حاصل تھی، ذریعۂ مبادلہ بن گئی ہوگی اس کی حمایت میں تاریخی شہادتیں موجود ہیں مثال کے طور پر ان علاقوں میں جہاں چاول اہم غذا کی حیثیت رکھتا ہے، ابتدا میں چاول کے ذریعہ سے چیزوں کی لین دین کی جاتی تھی مختلف علاقوں میں ان کی معاشی خصوصیت کے لحاظ سے مختلف چیزیں اس حیثیت سے کام میں لائی گئی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر ارک رول نے کہا ہے

"بالواسطہ مبادلہ کی ابتدا میں ہی ہم دیکھتے ہیں کہ زر وہ چیز ہوتی تھی جو معاشرہ کے لئے کوئی خاص اہمیت رکھتی ہو (مثلاً خانہ بدوش کے لئے جانور، شکاریوں کے لئے کھال بہت اہم چیزیں تھیں اور اُن جماعتوں میں جن کا پیشہ یہی تھا، یہی چیزیں زر کا کام دیتی تھیں) یہ ایسی چیزیں ہوتی تھیں جو اکثریت کی نظر میں بہت وقیع ہوتی تھیں اور اس لئے قیمتی سمجھی جاتی تھیں

ان دونوں نظریوں میں کولبورن کا خیال ہے کہ کوئی تضاد نہیں۔ اور یہ لائے

اور ایک مادی

کے قسم کا سوال ہے۔ زر کے یہ دونوں پہلو، کہ وہ ایک خیال ہے، اور ایک مادی چیز جس کے ذریعہ سے مختلف چیزیں خریدی اور بیچی جا سکتی ہیں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور شروع میں ان دونوں سے جو بھی خصوصیت پہلے وجود میں آئی ہو مبادلہ کے کام کا آسانی سے انجام پانا ان دونوں خصوصیتوں کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ہوا غالباً یہ ہوگا کہ دونوں خصوصیتیں ساتھ ساتھ ہی نمایاں ہوئی ہوں گی۔ لوگ جن چیزوں کی مدد سے قیمتوں کا تعین کرتے ہوں گے۔ ضرورت کے وقت اُسے ہی چیزوں کے حصول کے لئے بھی کام میں لاتے ہوں گے۔ لین دین کرنے والوں کے پاس اگر اس چیز کی جو عام طور پر مقبول ہوتی ہوگی زیادتی ہوتی ہوگی تو وہ اسے دے کر دوسری چیزیں حاصل کر لیتے ہوں گے، ورنہ پھر اس کی مدد سے مختلف چیزوں کی باہمی قیمت کا اندازہ کر لیتے ہوں گے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس روشنی میں اگر زر کے آغاز کا پتہ ڈھونڈا جائے تو بھی زر کی یہی دو خصوصیتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ پرانے زمانہ میں جب ابھی زر کا ایجاد نہیں ہوا تھا لین دین کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کوئی چیز دے کر دوسری کوئی چیز حاصل کر لیں۔ ہمارے ملک کے گاؤں میں چھوٹے پیمانہ پر یہ طریقہ اب بھی ملتا ہے، لوگ اناج، یا اسی طرح کی اور چیزوں کے بدلے میں تیل اور ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں لیکن مبادلہ کے اس طریقہ میں بعض بڑی نمایاں خرابیاں ہیں۔ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ مبادلہ کے اس طریقہ کے تحت لین دین تبھی ہو سکتی ہے جب کہ سودا کرنے والی دونوں جماعتوں کی ضرورت ایک دوسرے سے پوری ہو جائے۔ مثلاً عبدل کو اگر چھڑے کی ضرورت ہے اور وہ اس کے

بدلے میں صرف کچھ نار دے سکتا ہے تو اس کی یہ ضرورت اُس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی ملاقات کسی ایسے آدمی سے نہ ہو جائے جسے نار کی ضرورت ہو اور وہ چمڑا بیچنا چاہتا ہو۔ بعض پرانے سفرناموں میں ایسی کہانیاں ملتی ہیں جن سے اس طریقہ لین دین کی خرابی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہ تصور کرنا مشکل نہیں کہ ایسے آدمی کی تلاش میں جس کے پاس وہی چیز فاضل ہو جو آپ کو چاہیئے، اور اُسی چیز کی کمی ہو جو آپ کے پاس زیادہ مقدار میں موجود ہے کتنی دقت و پریشانی ہوتی ہو گی، اور کتنا وقت فضول ضائع جاتا ہوگا۔ زر کے استعمال سے یہ دقت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر آپ کے پاس روپے ہیں تو آپ جو چاہیں جو چیز خرید سکتے ہیں، دوکاندار روپے کے عوض کوئی بھی چیز دینے کو آمادہ ہو جائے گا کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ان روپیوں سے جو کچھ بھی چاہے گا خرید سکے گا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے جب لین دین کا کام خرید و فروخت دو حصوں میں بٹ جائے تو پھر یہ صورت باقی نہیں رہ جاتی کہ لوگوں کی ضرورتیں ایک دوسرے سے ایک ہی جگہ کسی خاص وقت میں پوری ہو جائیں۔

لیکن یہاں جنس کے بدلے میں جنس کے مبادلے کی خرابیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس طریقے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس کے تحت مختلف چیزوں کے دام چکانے کا سوال بھی آسانی سے حل نہیں ہو سکتا۔ ایک بکری کتنے آلو کے برابر ہو گی، کتنے آلو میں ایک بیل مل سکے گا، اور اس طرح کی اَن گنت چیزوں کے آپس میں دام کیسے طے ہوں، یہی نہیں اس سلسلے میں ہمیں ایک

زض کیجئے کہ کسی کے پاس ایک گائے ہے، اور اسے اس کے بدلے میں کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ گائے کے ٹکڑے کئے جائیں تو اس کی گائے کی حیثیت سے قیمت ختم ہو جاتی ہے، اور ادائگی کا دوسرا ذریعہ کیا ہے؟ ممکن ہے ابتدائی ایام میں جب کہ معاشی زندگی سادہ تھی، اور ضرورت کی چیزیں معدودے چند، یہ ہو سکتا ہو کہ لوگ کسی طرح رواج کی مدد سے مختلف چیزوں کے دام طے بھی کر لیتے ہوں، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زر کی ایجاد اس طرح ہوئی کہ پہلے اس کی یہ خصوصیت سامنے آئی کہ وہ ایک خیال ہے جو ناپ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اُن کی رائے میں ایسا ہوا بھی ہے کہیں فرض کیجئے اس معاشرہ کی چیزوں کے دام میں ٹھیراؤ نہ رہ سکے۔ تھوڑی سی ترقی ہو اور کسی چیز کا بنانا پہلے سے کم محنت یا وقت لینے لگے، اگر ابتدا میں ان ہی چیزوں کو قیمتوں کے طے کرنے میں معیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہو تو ظاہر ہے مختلف چیزوں کے دام بدلنے لگیں گے۔ اس لئے رواجی دام باقی نہیں رہ سکیں گے۔ ظاہر ہے ان حالات میں لین دین کا کام بُری طرح درہم برہم ہو جائے گا، کیونکہ چند چیزوں کے دام تو خیر آدمی یاد بھی کر لے سکتا ہے لیکن سیکڑوں ہزاروں چیزوں کے دام کا یاد رکھنا خصوصًا جب یہ دام بھی بدلتے رہیں، ناممکن سی بات ہے۔

بہت ہی شروع کے زمانہ میں ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز کے ذریعہ لین دین کا کام ہو جاتا ہوگا، ایسی ابتدائی سماج میں ان دقتوں کا حل مل جانا تصور میں آ سکتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خرابیاں

یا دقتیں زیادہ نمایاں ہوتی گئیں، اور اس لئے زر کا استعمال شروع ہوا۔ اس طرح چیزوں کے براہ راست ادل بدل کی دقتیں ختم ہوگئیں۔ زر کو مختلف چیزوں کے ناپ کا پیمانہ بنا لیا گیا، اس طرح یہ دشواری نہیں باقی رہ گئی کہ مختلف چیزوں کے دام یاد رکھے جائیں۔ یہ بھی پریشانی ختم ہوگئی کہ ایک قیمتی چیز کے بدلے میں جس کے حصے بخرے نہ کئے جا سکیں، بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں کیونکر حاصل کی جا سکتی ہیں اس لئے کہ روپے کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک پیسہ، آدھی پائی بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کے خریدنے میں کام آتے ہیں ادھر دوسری طرف لاکھوں، کروڑوں کا سودا بھی دشوار نہیں۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ زر کی دو خصوصیتیں یا دو کام زیادہ نمایاں ہیں ایک تو یہ کہ وہ چیزوں کی قیمتوں کے لئے ناپ کا کام دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مختلف چیزوں کے مبادلے کے لئے ایک مادی ذریعہ کا کام دیتا ہے یعنی روپے کے بدلے میں ہم مختلف چیزیں حاصل کر سکتے ہیں، اور مختلف چیزوں کے بدلے میں روپیہ ملتا ہے۔ ان میں سے کسی خصوصیت کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اہم تر ہے، مشکل ہے۔ اگر زر کی مدد سے مختلف چیزوں کی قیمتیں طے نہ ہو پائیں تو پھر مختلف چیزوں کے مبادلے میں روپیہ مددگار نہیں ہو سکے گا۔ اسی طرح اگر روپے سے محض قیمتوں کے ناپ کا کام لیا جائے تو بعض اوقات چیزوں کی لین دین میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ کراؤتھر کا کہنا ہے کہ زر کا یہ دوسرا کام زیادہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم مختلف چیزوں کی قیمتیں کسی بھی

چیزوں کی قیمت بتانے کے لئے گنی کام میں آتی ہے، لیکن آج گنی کے نام کا کوئی سکہ انگلستان میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس مثال کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گنی تو ضرور ختم ہوگئی ہے لیکن اس کا موجودہ پونڈ سے ایک معلوم و مشہور رشتہ ہے اگر یہ رشتہ اتنا معلوم و مشہور نہ ہوتا تو کیا پھر یہ ممکن ہوتا کہ قیمت کے ناپنے کے لیے تو گنی کا استعمال کیا جاتا مگر لین دین کیلئے پونڈ کا؟ کیا پھر بھی گنی کا کام زیادہ بنیادی اہمیت کا مالک ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ زر کے یہ دونوں پہلو، یہ دونوں کام یکساں اہم ہیں، اور ان میں کسی ایک کو فضیلت دینا ممکن نہیں

زر کے ایک اور کام کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ زر کے استعمال سے پہلے لوگ اپنی ضرورت کی سبھی چیزیں بچا کر محفوظ رکھتے ہوں گے، اناج، سبزیاں، کپڑا اور اسطرح کی چیزیں، تاکہ وقت پڑنے پر انھیں دشواری اور دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام میں بہت سی جگہ لگتی ہوگی، اناج رکھنے کے لئے کھتیاں بناتے ہوں گے، جانوروں کے گلوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے اختیار کرنے ہوتے ہوں گے یعنی اس طرح اپنی دولت کو محفوظ رکھنے میں لوگوں کو بہت سی دقتیں پیش آتی ہوں گی لیکن زر کے استعمال کے بعد یہ مسئلہ بمقابلتہً بہت آسان ہوجاتا ہے۔ ایک آدمی نے اگر کچھ روپے پس انداز کر لئے ہیں تو اب اسے آئندہ اپنی ضرورتوں کے سلسلے میں پریشانی نہیں ہوگی کیونکہ جب بھی وہ چاہے گا ان روپیوں کی مدد سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکے گا۔

ان تین بنیادی فرائض کے علاوہ زر کا ایک کام اور بھی ہے۔ اور وہ یہ

روپیہ مستقبل میں چیزوں کی قیمت کی ادائگی کے لئے بھی ایک معیار کا کام دیتا ہے۔ روپے کے استعمال سے پہلے اگر کوئی کسی سے کچھ چاول اُدھار لیتا ہوگا تو اُسے یہ چاول ہی واپس دینے ہوتے ہوں گے، اب آپ بجائے چاول، یا کسی اور چیز کے روپے ادھار لے سکتے ہیں، اور جب ادائگی کا وقت آئے تو روپے ہی سے قرض بھی چکا سکتے ہیں، اس طرح قرض کی لین دین میں روپے کی ایجاد سے بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔

ہم نے اوپر زر کے چار فرائض یا کام تو گنا دیئے ہیں اور ان سے آپ کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ روپے کا کام کیا ہے لیکن روپے کی تعریف ہم نے ابھی تک نہیں کی۔ اس منزل پر اب ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔ زر کی ایک بڑی آسان تعریف تو یہ ہے کہ جو چیز زر کے کام کرے وہ زر ہے، یعنی جو چیز بھی یہ چاروں کام انجام دے سکے اُسے زر سمجھنا چاہیئے۔ یہ تعریف عملاً تو بہت اچھی ہے، لیکن نظری حیثیت سے یہ کافی نہیں، ہمیں تو کوئی ایسی تعریف ڈھونڈھنی ہوگی جس سے ہم زر کے حلقہ سے ہر دوسری چیز کو خارج کر سکیں، کراؤتھر نے زر کی یہ تعریف کی ہے کہ "جو چیز بھی مبادلے کیلئے ایک ذریعے (یا قرض کی ادائگی کیلئے ایک ذریعے کی حیثیت سے عام طور پر مانی جاتی ہو وہ زر ہے"۔ زر ہونے کیلئے سب سے بڑی شرط ہے کہ عام لوگ اس چیز کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوں خاص خاص مواقع پر ممکن ہے بہت سی چیزیں دام چکانے یا قرض کی ادائیگی کی خاطر قبول کرلی جائیں لیکن جب تک وہ چیزیں ہر شخص قبول کرنے کو تیار نہ ہو ہم انھیں زر کا رتبہ نہیں دے سکتے۔ زر کی یہ تعریف تجارتی دنیا میں اور ماہرین معاشیات میں سب سے زیادہ رائج ہے۔

ہمارے سماج میں زر کی اہمیت

زر کے فرائض سے بحث کر چکنے کے بعد مناسب ہو گا کہ ہم موجودہ سماجی زندگی میں زر کی اہمیت پر ایک نظر ڈال لیں۔ اس بحث کے آغاز کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہو گا کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ کسی معاشی نظام کے بنیادی مقاصد کیا ہوتے ہیں۔ معاشی سوالات پیدا اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان کی خواہشیں یا مقاصد لاتعداد ہیں، اور ان خواہشات کی تشفی کے ذرائع محدود۔ اسی لئے مجبوراً ہم میں سے ہر شخص کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ہم کیا مقاصد چنیں، اور کن مقاصد کو قربان کر دیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ جیسا کہ پروفیسر نائٹ نے کہا ہے کسی بھی معاشی نظام کے لئے چند اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا بنیادی سوال تو یہ ہے کہ کون کون سی چیزیں تیار کی جائیں اس لئے کہ ہر چیز کا تیار کرنا ناممکن ہے، دوسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کی پیداوار میں ذرائع پیداوار کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ ہمارے پاس کوئی بھی ذریعہ پیداوار اتنی مقدار میں نہیں کہ ہم جس چیز کے پیدا کرنے میں چاہیں جتنا لگا دیں۔ تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ جب یہ چیزیں تیار ہو جائیں تو انھیں کس طرح لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ پیداوار کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کا وسیلہ ہاتھ آ جائے اس لئے اگر ہم ایسا کوئی طریقہ نہ نکال لیں جس کی مدد سے ملک کی پیداوار ملک کے باشندوں میں

بانٹی جا سکے تو لوگوں کی ضرورتیں یا خواہشیں پوری نہیں ہو سکیں گی اور پیداوار کے سلسلے میں جو محنت کی گئی ہوگی وہ اکارت جائے گی یعنی دوسرے الفاظ میں ہر ملک، یا معاشی نظام کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ملک کے ذرائع پیداوار کو (مثلاً) بندوقیں بنانے کے کام میں لگایا جائے یا بھوکوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر اناج پیدا کرنے میں، پھر اگر یہ طے ہو کہ یہ دونوں ہی کام اہم ہیں تو یہ طے کیا جائے کہ کتنے مزدور اور کتنا سرمایہ اول الذکر کام میں لگایا جائے، اور کتنا دوسرے کام میں۔ اور سب سے آخر میں یہ سوال کہ جب یہ دونوں چیزیں کچھ مقدار میں تیار ہو جائیں تو انھیں کس طرح لوگوں میں بانٹا جائے۔

اب آیئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ موجودہ معاشی نظام میں جسے سرمایہ داری کہتے ہیں ان تینوں بنیادی مسائل کو کیونکر حل کیا جاتا ہے سرمایہ داری کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات ہمیں ذہن میں بٹھا لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس نظام کی کارکردگی میں لاشخص اثرات کو بہت بڑا دخل حاصل ہے یعنی اس نظام میں کوئی مرکزی بورڈ، یا چند افراد ایک جگہ بیٹھ کر یہ طے نہیں کرتے کہ اوپر ہم نے جو تین بنیادی سوالات گنائے ہیں انھیں کیونکر حل کیا جائے۔ اس نظام کے تحت ہوتا یہ ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت ہوتے ہیں، اور ان کا ہر مالک اپنی جگہ پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کیا چیز بنائے گا۔ یا کس چیز کی تیاری میں اپنا سرمایہ لگائے گا۔ اس طرح افراد کے یہ فیصلے جو اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر، اپنی اپنی عقل و سمجھ یا ناسمجھی کی بنیاد پر ہوتے ہیں مل جل کر یہ طے ہو جاتا ہے کہ پورے ملک میں کیا چیزیں تیار ہوں گی اور ان میں کتنا سرمایہ لگے گا۔ لیکن افراد کے ان فیصلوں میں

سرمایہ داری کے حامیوں کو
اس بات پر فخر ہے کہ یہ فیصلے کوئی ایک آدمی نہیں کرتا، بلکہ ایک لاشخصی عنصر یا چیز
ایک طرح کی ہم آہنگی، یا ربط پیدا کرنا ضروری ہے، سرمایہ داری کے حامیوں کو
یعنی قیمتیں کرتی ہیں۔ اگر ایک آدمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ پلاسٹک کی چوڑیاں
بنائے گا تو اسے اس فیصلہ کا پورا حق ہے۔ میں یا آپ یا کوئی بھی اس سے یہ نہیں کہہ سکتا
کہ نہیں تم ایسی چوڑیاں نہ بناؤ۔ لیکن چوڑیاں بنانے کی شرط یہ ہے کہ اس آدمی کو
ان چوڑیوں کے جو دام ملیں وہ ایسے ہوں کہ اسے اپنے خرچ سے زیادہ آمدنی ہو جائے
اگر ایسا ہوا تو اسے نفع ہوگا، اور سمجھنا چاہیے کہ اس کا فیصلہ صحیح ہے، کیونکہ لوگ
ان چوڑیوں کے خواہشمند ہیں (یہاں برسبیل تذکرہ یہ بات بتا دینا مناسب ہوگا کہ
سرمایہ داری میں ضرورت یا خواہش فیصلہ کن نہیں۔ قبل اس کے کہ کسی سرمایہ دار پر آپ کے
فیصلے کا کوئی اثر پڑے آپ کے پاس دام ہونے چاہئیں جس کی مدد سے آپ اس کی
چیز خریدیں، یا اس کی چیز کو ترک کر کے کسی اور کی دکان سے کوئی اور چیزیں خریدیں۔
اگر آپ میں کسی چیز کی خریدنے کی قوت نہیں، تو آپ کا وجود سرمایہ دارانہ نظام کے
لئے عدم کے برابر ہے) اور ان کے اچھے دام دینے پر آمادہ۔ مختصر یوں سمجھئے کہ معاشی
نظام کا پہلا سوال یعنی یہ طے کرنا کہ کون سی چیزیں بنائی جائیں اور سماج کے کن مقاصد کے
پورا کرنے کا سامان کیا جائے یوں طے ہوتا ہے کہ جو چیز بنانا نفع بخش ہو وہ بنائی جاتی ہے،
سماج کی جن خواہشوں کے پورا کرنے میں نفع کا امکان ہوتا ہے سرمایہ داران کو
پورا کرنے کا سامان کرتے ہیں۔

اور یہی چیز یہ بھی طے کرتی ہے کہ ذرائع پیداوار کو کس طرح مختلف چیزوں کے
بنانے میں تقسیم کیا جائے۔ سرمایہ دار یہ دیکھتا ہے کہ کس چیز میں سرمایہ لگائے

یا دوسرے الفاظ میں یہ دیکھے کہ ذرائع پیداوار کو کن چیزوں میں لگانے میں زیادہ فائدہ ہوگا اور پھر وہ اپنے ذرائع کو اسی کام میں لگا دیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک چیز میں نفع کم ہے، تو وہ کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو زیادہ نفع بخش ہے اور اس طرح ہر شخص اپنے ذرائع کو ایسے ہی کام میں لگاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نفع بخش ہو۔ سرمایہ داروں کے نقطۂ نظر سے ظاہر ہے یہ صورت حال سب سے بہتر ہے کہ ذرائع کا وہ استعمال کیا جائے جن میں کم سے کم خرچ اور زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔ قیمتیں انھیں یہ بتاتی ہیں کہ ذرائع کا کون سا استعمال انہیں زیادہ سے زیادہ نفع دلانے کا ضامن ہوگا۔ اگر ہر شخص کی آمدنی لگ بھگ ایک سی ہوتی (اور بعض اور شرطیں پوری ہوتیں) تو یہ صورت حال عام لوگوں کے لیے بھی سب سے اچھی ہوتی کیونکہ اس صورت میں ضرورت یہ فیصلہ کرتی کہ کون سی چیز بنانا چاہیے کون سی نہیں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ امیروں کے پاس مختلف چیزیں خریدنے کے لیے دام ہوتے ہیں اور اس لیے ان کی خواہشات کے پورا کرنے کا سامان کرنا نفع کا سودا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اس سوال سے بحث نہیں کرنا ہے، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ قیمتوں کی سہولتوں کی بدولت، یا دوسرے الفاظ میں اس سہولت کی وجہ سے کہ بازار میں ہر چیز کا ایک دام ہوتا ہے مختلف چیزوں کے بنانے والوں کو مختلف فیصلے کرنے میں کتنی سہولت ہو جاتی ہے۔

تیسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے وہ سماج کے مختلف افراد تک کیسے پہونچتا ہے۔ یہاں بھی بازار ہی ان چیزوں کی تقسیم کا ذریعہ ہے۔ زر کی بدولت یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کی قیمت متعین کر دی جائے۔

بیچنے والے یہ کوشش کرتے ہیں کہ قیمتیں ایسی رہیں کہ وہ جو کچھ بھی بنائیں وہ بک جائے۔ اس لئے ایک قیمت پر آپ کی ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے زر کی خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت آپ کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ آپ جو چیز چاہیں حاصل کر لیں، اب یہ فیصلہ کہ کیا خریدیئے کیا نہ خریدیئے یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔ سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ صرف دولت کے معاملے میں یہ آزادی جو ہر شخص کو ملتی ہے، اس نظام کے محاسن میں سے ایک بڑا حُسن ہے۔ اسے مانیئے یا نہ مانیئے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زر کا استعمال دولت کے خرچ کے سلسلے میں بھی بہت ہی سہولت پیدا کر دیتا ہے۔

اوپر ہم نے عملاً سماج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ زر سے کیوں کر ان دونوں کے لئے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ زر کے بغیر سماج ان دو حصوں میں نہ بٹ سکتی، دوسرے الفاظ میں زر کے بغیر تقسیم عمل اور تخصیص کار کا وجود ناممکن ہوتا۔ کیونکہ اگر زر کا استعمال نہ ہوتا تو ہر شخص اپنی ضرورت کی ہر چیز بنانے پر خود مجبور رہتا، کیونکہ ہم نے چیزوں کے ادل بدل کے بارے میں بحث کے وقت یہ دیکھا تھا کہ اس نظام کے تحت لین دین بہت چھوٹے پیمانے پر ہو سکتی ہے کام کی تقسیم سے یہ ممکن ہوا کہ ہر آدمی اپنی پسند اور صلاحیت کے مطابق ایک پیشہ چُن لیتا ہے اور اس طرح سماج کی مجموعی دولت اور صلاحیت پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم ابھی بہت پیچھے ہوتے؛ انسانی تہذیب بہت پست سطح پر ہوتی اور ہر آدمی جو کوئی چیز بنانا چاہتا، مجبور ہوتا کہ غذا، کپڑے

اور اس طرح کی ان گنت چیزوں کا اسٹاک رکھے تاکہ اس اسٹاک سے وہ مزدوروں کو اُن کی اُجرت ادا کر سکے، مزدوروں کو اجرت ان چیزوں کی شکل میں ادا کی جاتی جو مالک کے پاس بر وقت موجود ہوتیں۔ اس صورت حال کی دشواریاں بڑی آسانی سے تصوّر میں آسکتی ہیں، اس لئے انہیں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، زر کی پیدا کردہ بس ایک اور سہولت کا ذکر کرنا باقی ہے سرمایہ داری کا بہت سا کام قرض کی لین دین پر چلتا ہے۔ مل مالک مختلف لوگوں سے حصے بیچ کر یا دوسرے طریقوں سے روپیہ جمع کرتا ہے اور اس سے کارخانے چلتے ہیں۔ زر کی بدولت اس طرح کی لین دین بہت آسان ہو جاتی ہے۔ تھوڑی سی سیمنٹ، تھوڑا سا گارہ، تھوڑی سی اینٹیں مانگ کر مکان بنانا اس سے کہیں دقت طلب کام ہوگا، جتنا روپیہ قرض لے کر اور اس کی مدد سے قریب کی کسی مناسب جگہ سے یہ چیزیں حاصل کر کے مکان بنانا۔ اس سہولت کی وجہ سے بھی زر کا وجود موجودہ سماجی زندگی کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر لرنر کی رائے بہت مناسب ہے کہ زر کا وجود قیمتوں کے تعین کے لئے بہت مفید ہے، اور قیمتوں "کی غیر موجودگی میں ہمارے جیسے کسی پیچیدہ نظام معیشت کا چلنا ناممکن"۔ جیسا کہ کراؤتھر نے کہا ہے "زر انسان کی بنیادی اہمیت رکھنے والی ایجادات میں سے ایک ہے۔"

آئندہ صفحات میں ہم زر کی لائی ہوئی بعض مصیبتوں کا ذکر پڑھیں گے، دراصل زر کے مسائل کا مطالعہ اہم اسی لئے ہے کہ یہ مفید ایجاد جب انسان کے قابو سے نکل جاتی ہے، یا جب انسان کی زندگی میں کبھی آجاتی ہے، تو کتنی بکار ...

لیکن اس وقت زر کی اہمیت کے سلسلہ میں چند اور جملوں کا اضافہ ضروری ہے۔ اوپر کی گفتگو سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ زر کا استعمال محض سرمایہ دارانہ نظام کیلئے اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک اشتراکی نظام میں یہ فیصلہ کہ کیا چیزیں بنائی جائیں، اور ذرائع پیداوار کو کس طرح ان چیزوں کے بنانے میں لگایا جائے نفع کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا۔ منصوبہ بندی کے ذمہ دار اداے سوچ سمجھ کر اور ملک و قوم کی ضرورت کا اندازہ کر کے مختلف چیزوں کے تیار کرنے کا انتظام کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود موجودہ منصوبہ بند ملکوں میں بھی قیمتوں کے نظام کو باقی رکھا گیا ہے کیونکہ مختلف منصوبوں کی معاشی اہمیت کا اندازہ لگانے کے سلسلے میں تجارتی نقطۂ نظر سے حساب کتاب کو خاصا دخل ہوگا۔ اور زر کے بغیر یہ حساب کتاب بھی ممکن نہیں ہوگا۔ زر کا وجود سماجی زندگی کے لئے، خواہ ہمارا معاشی نظام[۵] کچھ بھی کیوں نہ ہو بہت ضروری ہے۔

---

۵ اس سلسلے میں پروفیسر رابرٹسن کا ایک اقتباس جو "معاشیات سب کیلئے" کے مصنف ہیکو تھ نے زر کی اہمیت کی وضاحت کے سلسلے میں اپنی کتاب میں بھی دیا ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"زر کا سب سے پہلا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس کے استعمال کی بدولت آدمی کو صارف کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوت خرید کو عام بنا لے اور سوسائٹی میں جس شکل میں بھی چاہے اپنے اس حق کو استعمال کرے۔ زر کا استعمال نہ ہوتا تو لوگوں کو اُن کی خدمتوں کا معاوضہ کسی چیز کی شکل میں دینا پڑتا۔ پھر چاہے اُن کا راشن ہوتا یا اُنھیں کھلی ہوئی آزادی ملتی دونوں حالتوں میں چیزیں ضائع جاتیں اس لئے کہ پہلی حالت میں وہ بعض چیزیں زیادہ لیتے اور بعض کم لینے پر

مجبور ہوتے اور دوسری حالت میں وہ بالکل فضول خرچ ہو سکتے تھے۔ سوسائٹی میں زر کی موجودگی اسے اس بات کا پتہ لگانے میں مدد دیتی ہے کہ لوگ کیا کیا چاہتے ہیں اور کتنی کتنی مقداریں۔ اور اس طرح یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کونسی چیزیں اور کتنی پیدا کی جائیں۔ پیداوار کی محدود طاقت کا بہترین استعمال یوں ہی ممکن ہے۔ زر ہر فرد کی اس بات میں مدد کرتا ہے کہ وہ ان تمام تفریح کی چیزوں کو جن تک اس کی پہنچ ہے اس طرح استعمال کرے کہ وہ واقعتاً زیادہ سے زیادہ خوشی دیں۔

زر اُسے موقع دیتا ہے کہ وہ بس کی سواری ہی نہ کرتا رہے یا چارلی چپلن کی صورت سے اپنے کو ناواجب طور پر محروم رکھے۔

وہ لوگ جو کسی مثالی مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں وہ ایک ایسی معاشی سوسائٹی کا تصور کرتے ہیں جس میں عام استعمال یا خام اشیا کی جن کی سب کو ضرورت ہوتی ہے تقسیم کا انتظام کیا جاتا ہو لیکن یہ خیالی دنیا بھی غیر محدود دولت کی مالک نہیں ہو سکتی اس لئے ایک فرد کے مجموعی مطالبہ کو بھی محدود ہونا پڑے گا اور پھر چونکہ شخصی ضرورتیں اور پسند شاید ہمیشہ مختلف رہیں گی اس لئے لوگوں کو اپنے مطالبوں کے کم از کم بعض حصوں کو کسی شکل میں کرنے کا کچھ اختیار تمیزی دینا ہی پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں کسی نوع کا زر ـــــ اصلی آمدنی کا سرٹیفکٹ جس کے ذریعہ ایک شخص اس سے زر کی ترجمانی یا تخصیص کا کام لیا جا سکتا ہو ـــــ باقی رہے گا۔ اس طرح اگر بار آوری کی ایک دی ہوئی طاقت ـــــ آدمی کی قوت سے تعلق میں ایک خاص توازن ـــــ کا شخصی تسکین کی خاطر زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانا جو ممکن ہو تو زر کی ضرورت بنیادی معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا باب

۱۔ زر کی قسمیں

زر کی مختلف قسموں پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ چیزوں کی خرید و فروخت قرض کی ادائگی میں لوگ مختلف طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چیزوں کی خرید کیلئے اکنی، دونی اور اسطرح کے چھوٹے چھوٹے سکے کام میں لائے جاتے ہیں، پھر نوٹ ہیں جن پر یہ وعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اتنی رقم روپیوں کی شکل میں دی جائے گی، ہمارے ملک میں چاندی کا روپیہ بھی رائج ہے اور ایک روپیہ کا نوٹ جس پر کوئی وعدہ نہیں ہوتا، پھر بہت سے لوگ قیمتوں کی ادائگی چیک کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ان مختلف چیزوں میں سے کن کو ہم زر سمجھ سکتے ہیں اِن میں آپس میں کیا رشتہ ہے، ہمیں ان سوالات سے یہاں بحث کر لینا چاہیے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس سوال سے بحث کرنا ہے کہ اوپر کی فہرست میں ہم نے جن چیزوں کا نام گنایا ہے اُن میں سے کون زر کہلانے کی مستحق ہے، اور کون نہیں۔ سب سے پہلے چیک کا مقابلہ لیجیے۔ ہم نے زر کی تعریف یہ کی ہے کہ جو چیز بھی دام کے چکانے میں یا قرض کی ادائگی میں عام طور پر قابل قبول ہو وہ زر ہے۔ اس تعریف پر چیک کو تولیے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ چیک زر کی فہرست میں شامل نہیں کیونکہ چیک آپ صرف اُس شخص کے ہاتھ سے قبول کرنے کو آمادہ ہوں گے جسے آپ جانتے ہوں، اور اُس پر بھروسہ کرتے ہوں کہ بینک میں اس کا اتنا روپیہ ہوگا

کہ یہ چیک بھن جائے۔ لیکن آپ کو چیک کاٹنے کا حق بینک سے صرف اسی طرح مل سکتا ہے کہ آپ کچھ رقم بینک میں جمع کریں (یا بینک آپ کو کوئی رقم قرض دے) یہ رقم جو بینک میں آپ کے نام جمع ہو ضرور زر ہے کیونکہ اس رقم کو آپ جس کسی کو بھی دیں وہ اسے قبول کرلے گا۔ اس کے برخلاف اگر آپ کسی کو پانچ پانچ روپیوں کی شکل میں بڑے سے بڑا قرض ادا کریں تو وہ خوشی سے اسے منظور کرلے گا، اور اگر وہ خوشی سے نہ منظور کرے تو پھر قانون اُسے منظور کرنے پر مجبور کرے گا۔ کیونکہ پانچ روپے کے نوٹ (اور اسی طرح دوسرے نوٹ) زرِ قانونی ہیں، یعنی قانوناً ان کا منظور کرنا ضروری ہے۔ چیک اس ضمن میں نہیں آتا۔ زر کی پہلی تقسیم یہ ہوئی:۔ (۱) زرِ قانونی اور (۲) زرِ بینک زرِ قانونی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پانچ روپے کا نوٹ یا چاندی کا روپیہ آپ بڑی سے بڑی رقم ادا کرنے کیلئے بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی کو آپ سَو روپے ادھنوں کی شکل میں ادا کریں تو اسے انکار کر دینے کا حق ہوگا کیونکہ چھوٹے سکے جیسے ادھنیاں وغیرہ ایک خاص حد تک زرِ قانونی ہیں، وہ نوٹوں کی طرح غیر محدود زرِ قانونی نہیں۔

پانچ روپے کے نوٹ پر آپ نے یہ عبارت دیکھی ہوگی "میں پانچ روپے دینے کا وعدہ کرتا ہوں"۔ یہ وعدہ زر کی ایک قسم سے اور روشناس کرتا ہے۔ زر کی ایک تقسیم یہ ہے: معیاری زر، اور دوسری شکلوں میں بدلا جانے والا زر۔ معیاری زر تو وہ ہے جس کے بدلے میں آپ کو کسی اور قسم کا زر مانگنے کا حق نہ ہو، دوسری قسم اُن سکوں پر مشتمل ہوتی تھی جو یہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جن کے عوض دوسرے سکے مانگنے کا ہر شہری کو حق ہوتا تھا۔ اب مثلاً ہمارے ملک میں

ہیں اور بس، لیکن ایک زمانہ تھا جب یہ چاندی کا روپیہ بھرپور چاندی کا روپیہ تھا۔ یعنی اس کی قیمت دراصل اس چاندی کی قیمت تھی جس سے وہ بنا تھا اب تو اس میں گھٹتے گھٹتے چاندی نام کو ہی رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود اس کی حیثیت قطعی ہے۔ نوٹ یہ حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کے بدلے میں روپے دینے کا وعدہ اب بھی ہوتا ہے۔ نوٹوں پر چھپا ہوا یہ وعدہ دراصل اسی زمانہ کی یاد دلاتا ہے جبکہ ان کے بدلے میں آپ چاندی کے روپے مانگ سکتے تھے جن میں بھرپور چاندی ہوتی تھی ورنہ یہ وعدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، آج آپ نوٹ ریزرو بینک کے پاس لے جایئے تو بدلے میں آپ کو چھوٹے نوٹ مل جائیں گے، ممکن ہے چاندی کے یہ روپے مل جائیں اور کچھ نہیں ہاتھ لگے گا، ہاں اگر آپ کو بیرون ملک میں کسی کا کوئی قرضہ چکانا ہو تو روپے کے عوض میں اب سے کچھ پہلے آپ کو اسٹرلنگ مل جاتی، یا اب ریزرو بینک کو قانوناً یہ حق مل گیا ہے کہ وہ ہر ملک کا سکہ خرید اور بیچ سکتا ہے، تو آپ کو کسی اور ملک کا سکہ مل جائیگا۔ جہاں تک اپنے ملک میں ادائگیوں کا تعلق ہے روپیہ اور نوٹ وغیرہ ہی معیاری زر کی حیثیت رکھتے ہیں، حالانکہ ان کی حیثیت نشان سے زیادہ نہیں کیونکہ ان کی اندرونی قیمت بہت کم، اور نوٹوں کی تو بالکل نہیں۔

زر کی ایجاد کے ابتدائی ایام میں لوگ ان چیزوں کو زر کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے جن کی اپنی کچھ قیمت ہو۔ چنانچہ جیسا کہ سر جارج میکڈونلڈ نے کہا ہے "جانی پہچانی دھاتوں میں کم ہی ایسی ہیں جن کو کبھی نہ کبھی سکہ ہونے کا شرف حاصل نہ رہا ہو" زر کی حیثیت سے استعمال ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس چیز میں

کچھ خصوصیات موجود ہوں پہلی بات تو ظاہر ہے کہ یہ ضروری تھی کہ وہ چیز مقبول عام ہو، زر کے علاوہ بھی لوگ اس کے خواہش مند ہوں، پھر جسامت کے لحاظ سے ان کی قیمت زیادہ ہونا بھی ضروری ہے، فرض کیجئے لوہا زر کی حیثیت سے استعمال ہو تو سو روپے کے سکے لیکر چلنا طاقت کا اچھا خاصا امتحان بن جائے گا، اس کے برخلاف اتنی قیمت کا سونا، یا چاندی آسانی سے اٹھایا جا سکتا ہے، اگر یہ خصوصیت ہو تو ایک فائدہ اور بھی ہوگا وہ یہ کہ اگر آپ روپیہ پس انداز کرنا چاہیں، یا رکھنا چاہیں تو اس کے لئے تھوڑی سی جگہ کی ضرورت ہوگی، اس کام کے لئے زر کی ایک خصوصیت اور بھی ضروری ہوتی ہے، اور وہ ہے اسکی پائداری مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی زر کی حیثیت سے استعمال ہو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ موسم کی دست برد اور وقت کے ساتھ ساتھ فنا ہو جانے سے بچی رہے۔

یہ خصوصیات قیمتی دھاتوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں اس لئے زر کی تاریخ کے ابتدائی ایام میں ہی یہ قیمتی دھاتیں زر کے طور پر استعمال ہونے لگیں سکوں کے طور پر ان دھاتوں کا استعمال ایک اور وجہ سے بھی اس زمانے میں ضروری تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ چونکہ زر دولت کی کنجی ہے اس لئے اسے خود بھی قیمتی ہونا چاہیے۔ بہت سے لوگ تو آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ زر کی قیمت دراصل اس سونے یا اور قیمتی چیزوں کے ذخیرہ پر مبنی ہے جو بینک زر کے بدلے میں محفوظ رکھتے ہیں۔ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ زر خود قیمتی چیز ہو، ورنہ اس کی پشت پر کوئی قیمتی چیز ہونی چاہیئے، اس عام نفسیات کا ایک اچھا مظاہرہ ہمیں جرمنی کی تاریخ سے ملتا ہے پہلی جنگ عظیم کے بعد جب جرمنی میں افراط زر کی مصیبت اپنی انتہا کو پہونچ گئی تھی، روپے کی قیمت یا قوت خرید بہت گھٹ گئی تھی اور لوگوں کو روپے پر کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا تو جرمن حکومت نے ایک نیا سکہ جاری کیا [illegible]

رکھا گیا تھا، اس کے متعلق اعلان یہ کیا گیا تھا کہ اس کی پشت پر جرمنی کی کل زمین ہے۔
یہ قانونی فریب کامیاب رہا اور چونکہ لوگوں میں یہ خیال عام ہے کہ زر اگر خود قیمتی
چیز ہو، یا کسی قیمتی چیز کی نمائندگی کرے تو وہ اچھا زر ہے اس لئے لوگوں نے اس
نئے جرمن سکے کو قبول کر لیا۔

لیکن یہ خیال بہت ہی غلط خیال ہے۔ اگر ذاتی قیمت زر کیلئے سب سے اہم
خصوصیت ہوتی تو ہیرے اور جواہرات زر کا کام دیتے، لیکن انہیں زر کی حیثیت سے
کبھی بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ چاندی کو زر کی حیثیت سے زیادہ تر ملکوں نے استعمال کیا ہے۔
سونا یہ جگہ نہیں لے سکا، اس لئے کہ سونا بہت قیمتی ہے، اور سونے کے سکے سے صرف
بڑی بڑی رقموں کی ادائگی کا ہی کام لیا جا سکتا تھا۔ زر کی حیثیت سے استعمال ہونے کیلئے
ضروری ہے کہ جو چیز بھی یہ کام انجام دے اس کی مقدار کم ہو لیکن بہت کم بھی نہیں۔
اور زر کی قیمت در اصل اس قلت کی وجہ سے ہوتی ہے، چنانچہ آج جب ہم نے
کاغذ کا روپیہ چھاپنا شروع کر دیا ہے اس اصول کی سچائی بالکل صاف سی بات ہے۔

کاغذ کے روپے کی ایجاد زر کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ کراؤتھر نے
اس کے ارتقا کی چار منزلیں گنائی ہیں۔ دھات کے سکوں میں بہت سی خوبیاں
ہیں لیکن ان میں ایک کمی تو یہ ہے کہ ان کا وزن کافی ہوتا ہے، دوسرے چوری کا
ڈر بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ شاید ان خرابیوں کی وجہ سے تاجر پرانے زمانے میں بھی
اپنے ساتھ لمبی چوڑی رقمیں لے کر چلنا پسند نہ کرتے ہوں گے، بلکہ اس کے بدلے
میں کوئی ایسے کاغذی ثبوت لیکر چلتے ہوں گے جن سے یہ ثابت ہو کہ ان کے
پاس اتنی رقم موجود ہے۔ یہ چیزیں زر کی ملکیت کا عارضی ثبوت ہوتی ہوں گی

انھیں عارضی یا نمائندہ زر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کاغذی ثبوت ظاہر ہے کسی معلوم و مشہور تاجر کے سرٹیفکیٹ ہوتے ہوں گے کہ فلاں کے پاس اتنی رقم واقعتاً موجود ہے۔ یہ شاید کاغذی زر کے ارتقاء کی پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب یہ کاغذی ثبوت خود زر کی حیثیت سے استعمال ہونے لگے ہوں گے۔ یہ کاغذی ثبوت کچھ رقموں کی ادائگی کے وعدوں کی شکل اختیار کر لیتا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ ثبوت یہ ہو کہ فلاں نے اتنی رقم کہیں جمع کر رکھی ہے، یہ کاغذ دینے والا کہتا ہوگا کہ وہ اتنی رقم مطالبہ کرنے پر ادا کر سکے گا۔ پھر یہ وعدے چھوٹے چھوٹے نوٹوں کی شکل میں جاری کئے جانے لگے ہونگے، دوسرے الفاظ میں بینک نوٹ کا زمانہ آپہونچا۔ ہمارے رزرو بینک کے نوٹوں پر اس طرح کا ایک وعدہ لکھا ہوتا ہے، یہ اُن ہی بینک نوٹوں کی یادگار ہے، لیکن ابھی یہ نوٹ عام طور پر زر نہیں سمجھے جاتے ہوں گے، اگرچہ ان سے زر کا کام لیا جانے لگا ہوگا، دھیرے دھیرے لوگ ان نوٹوں کے عادی ہو گئے ہوں گے، اور پھر یہ نوٹ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور پھر تیسرے اور اسی طرح دست بدست گشت کرنے لگے ہوں گے، ہر شخص کو اب یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ جب بھی وہ چاہے اُن نوٹوں کو زر کی شکل میں تبدیل کر سکتا ہے، اس لئے لوگ اس یقین کے بھروسے پر خرید و فروخت میں ان نوٹوں کو آسانی سے قبول کرنے لگے ہوں گے۔ تجربہ سے یہ نوٹ جاری کرنے والے اداروں نے یہ سبق سیکھا ہوگا کہ لوگ ان سے اتنی نقد رقم کا مطالبہ نہیں کرتے جتنے کہ انھوں نے نوٹ جاری کر رکھے ہیں، اب اگر نقدی کا مطالبہ جاری شدہ نوٹوں کی کل مقدار کے محض دس فیصدی کے

برابر ہو، تو یہ بینکر اُس سے کئی گُنا زیادہ رقم کے نوٹ چلا سکتے ہوں گے جتنی قیمت کی نقدی ان کے پاس محفوظ ہو۔ اب سے پہلے کے جو دور ہم گنائے ہیں اُن میں وعدے کے نوٹوں سے زر کی مجموعی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، کیونکہ ہر نوٹ کے بدلے میں بینکر کو اتنی ہی نقد رقم محفوظ رکھنی پڑتی ہے تاکہ جب کبھی بھی کوئی نقد کا مطالبہ کرے تو وہ اس مطالبے کو پورا کر سکے، اس تیسرے دور میں اب بینک نوٹوں سے زر کی مقدار میں بہت نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال سے شروع شروع میں بہت سے بینکروں نے فائدہ اٹھایا، اور زیادہ زیادہ رقم کے نوٹ جاری کر دیئے۔ لوگوں کو جب کبھی اس طرح کا کوئی شبہ ہوا تو کسی نہ کسی بینک کی شامت آئی، اور اسے دیوالیہ پن کا مُنہ دیکھنا پڑا کیونکہ شبہ ہوتے ہی لوگ اپنے نوٹ تڑانے آ پہونچتے تھے اور پھر بینک کو اپنا دروازہ بند کرنا پڑتا تھا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں بہت سے لوگوں نے اس سلسلے میں بے ایمانیاں کیں، اور کچھ اُن وجوہ سے اور کچھ یوں کہ ایجاد ایسی تھی جس سے اشخاص یا جماعتیں بہت فائدہ اٹھا سکتی تھیں حکومت نے نوٹوں کا جاری کرنا اپنے ذمہ لے لیا، کاغذی سکوں کی تاریخ کا یہ چوتھا دور ہے۔ آج ہر ملک میں کاغذ کے سکے مرکزی بینک جاری کرتا ہے۔ جس پر اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ پابندیاں لگائی جاتی ہیں،

بینک نوٹ کے متعلق بھی مدتوں یہ خیال رائج رہا کہ اگر اسے سونے کے سکوں میں تبدیل نہ کیا جا سکے تو اسے اچھا زر نہیں سمجھنا چاہیئے، یہ غلط فہمی کسی نہ کسی صورت میں اب بھی رائج ہے۔ اور نوٹ کی پشت پناہی کے لئے

سونے کا سہارا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک ملک میں نوٹ کے بدلے میں مرکزی بینک کو کچھ قیمتی اثاثہ زرِ محفوظ کے طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ پابندیاں اس لئے لگائی جاتی ہیں کہ مرکزی بینک بہت زیادہ مقدار میں نوٹ جاری نہ کردے۔ ان نوٹوں کی شروع کی تاریخ میں افراط کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، یہی ڈر تھا جس کی وجہ سے بینکوں پر پابندیاں لگائی گئیں اور آج تک وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور یہ نوٹ قانوناً آپ کو اس کا حق دیتے ہیں کہ آپ ان کے بدلے کوئی اور سکہ مانگ لیں، عملاً یہ بھی زرِ معیاری کی حیثیت رکھتے ہیں اور مدتوں کے استعمال سے لوگ اب ان نوٹوں کے عادی ہو گئے ہیں اور اب کسی کے ذہن میں انھیں بدلنے کا خیال نہیں آتا۔[1]

---

[1] پروفیسر رابرٹسن نے اپنی کتاب "زر" میں ایک مکالمہ لکھا ہے جس سے اوپر کی گفتگو پر مزید روشنی پڑتی ہے، یہ بات چیت ایک نوٹ اور مصنف کے درمیان ہوئی ہے، نوٹ کے متعلق یہ یاد رکھیئے کہ وہ ہمارے نوٹوں سے کسی طرح مختلف نہیں قانوناً دونوں ہی نوٹ دوسری طرح کے سکوں کی شکل میں بدلے جا سکتے ہیں لیکن عملاً اگر یہ مطالبہ کیا جائے تو بڑے نوٹ کے بدلے میں چھوٹے نوٹ، اور ہمارے ملک میں نوٹوں کے بدلے میں روپیہ مل سکتا ہے جس کی اپنی ذاتی قیمت اب بہت کم ہے یعنی یہ نوٹ اب زرِ معیاری سمجھے جاتے ہیں اور ہیں۔ مصنف نوٹ سے پوچھتا ہے "آپ کی شکل وصورت خاصی دلکش ہے، اور میں آپ کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جس سے آپ کی دل شکنی ہو لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ آپ میں عوان کی کمی ہے، اور آپ بہت کمزور ہیں۔ اگر آپ زر کی حیثیت
سے کام کرنا چھوڑ دیں اور کوئی اور کام شروع کر دیں تو کیا اپنی روزی کما لیں گے؟
کیا! پھر بھی لوگ آپ کی اتنی ہی قدر کریں گے، بدتمیزی معاف، کیا پھر
آپ کی یہی قیمت رہ جائے گی جواب ہے۔" اور نوٹ ناراض ہو کر جواب
دیتا ہے "بھئی تم کتنے بیوقوف اور قدامت پرست ہو، تم شاید سونے کے
سکوں سے میرا مقابلہ کر رہے ہو، سونے کے سکّے وقت پڑنے پر گلا کر دانت
بنانے کے کام آ سکتے ہیں، مگر میں کسی اور کام کا نہیں، اور کیوں ہوں؟
تم مکان سجانا چاہو، یا اپنے دانت بدلنا چاہو تو میں تمہارے کسی کام کا
نہیں، سونے سے تم یہ دونوں کام لے سکتے ہو، لیکن یہ تو بتاؤ تم خود ان میں
سے کونسا کام انجام دے سکتے ہو، پھر مجھ سے مطالبہ کیوں کہ میں اور کام
بھی کر دوں۔ اور ہاں ایک بات اور سن لو۔ یہ بات صرف ہمارے یعنی ہم
نوٹوں کے متعلق ہی صحیح نہیں، ہندوستان میں میرا ایک دوست ہے، چاندی
کا روپیہ۔ وہ وہاں کا معیاری زر ہے، کوئی اس کو کسی اور شکل میں بدلنے کا
مطالبہ نہیں کرتا اور شکل سے وہ خوبصورت بھی لگتا ہے اور ٹھوس بھی لیکن
اس کے اوپر جو عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے اُسے مٹا دو تو اس کی لاش کی
کوئی قیمت نہیں رہ جائے گی۔ کیونکہ اس کی قیمت بھی اس کے گوشت کی قیمت
نہیں، بلکہ اس کے چہرے پر جو لکھا ہوا ہے اس کی بدولت وہ قیمتی سمجھا جاتا ہے
اور ہے۔"

"اور ایک بات اور۔ یہ سونے کے سکّے جو اتراتے پھرتے ہیں اگر انہیں

بھی زر کے رتبے سے بہ یک وقت نکال دیا جائے تو ان کی یہ قیمت جو آج ہے ہرگز نہیں رہ جائے گی۔ ان کا خیال ہے کہ آدمی اُن پر اس لئے فدا ہے کہ ان کی شکل اچھی ہے اور شروع میں آدمی ان پر مرتا بھی تھا۔ لیکن اب تو ان کی کل اہمیت یہ ہے کہ وہ زر ہیں، تھوڑا سا سونا زر کا کام چھوڑ کر جب کسی اور کام میں لگتا ہے تو اس کی قیمت اپنی جگہ پر برقرار رہتی ہے اس لئے کہ جب بھی چاہے وہ زر کا پیشہ پھر اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن سب کو ایک ہی وقت میں نکالا جائے تو پھر ان کا ٹھکانا کہیں نہیں ہو گا۔ یہ جو تم دانت بنانے کی بات کرتے رہتے ہو، یہ بھی ان کے کام نہیں آئے گی۔ سمجھے" "اب تم کہو گے کہ پرانے یونانیوں کے جانور، ریڈ انڈین تمباکو اور چینیوں کے چاقو بھی مجھ سے اچھے تھے۔ کیونکہ ان چیزوں کو زر کے علاوہ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جانور کھائے جا سکتے تھے، تمباکو پی جا سکتی تھی اور چاقو سے تم اپنے دشمن کو ختم کر دے سکتے تھے۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ وزیر اعظم کا کام کوئی مسخرا زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتا ہے، جب وہ وزیر اعظم نہیں رہے گا تو اچھی نقلوں سے روٹی کمائے گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ اگر میں کبھی باہر چلا جاتا ہوں تو میری کوئی قدر نہیں رہ جاتی، غیر ملکی مجھے پسند نہیں کرتے، لیکن وہ بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے، بے وقوف، جاہل نہیں، مجھے اس کی کوئی ندامت نہیں کہ میں ایسا زر ہوں جس کی ذاتی کوئی قیمت نہیں، میں زر قانونی ہوں اور لوگ میرے ساتھ معیاری زر کا سلوک کرتے ہیں اور میرے لئے یہ کافی ہے۔"

آج کل رائج زر کی تین قسمیں ہیں۔ چھوٹے سکے جن سے چھوٹی موٹی چیزوں کی خرید و فروخت کا کام لیا جاتا ہے، حکومت یا مرکزی بینک کے جاری کردہ نوٹ اور زرِ اعتبار یا زرِ بینک۔

ہم اوپر کاغذی نوٹوں کے ارتقاء کی کہانی پڑھ چکے ہیں اب ہمیں تھوڑی سی باتیں باقی دو قسم کے زر کے متعلق جان لینا چاہئیں۔ چھوٹے سکے قیمت میں بہت ہی حقیر ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کی مدد سے چھوٹی چیزوں کی خرید و فروخت میں سہولت ہو۔ یہ سکے محدود رقموں کی ادائیگی کے لئے ہی زرِ قانونی ہوتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے زر کی اہمیت کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد سے ہوگا۔ امریکہ میں مارچ ۱۹۴۷ء میں سوسائٹی میں کل زر کی مقدار ۱۰۸٫۷ ملین ڈالر تھی۔ اس میں سے چھوٹے سکوں کی مقدار ۳٫۲ ملین ڈالر، حکومت کے نوٹوں کی مقدار کوئی ۲۷ ملین ڈالر اور زرِ بینک کی مقدار ۸۰٫۴ ملین ڈالر تھی۔ کم و بیش یہی صورت حال دوسرے ملکوں کی بھی ہے جہاں سرمایہ دارانہ نظام ترقی کر چکا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں بھی زرِ بینک کی اہمیت دوسری قسم کے زر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اور خود ہمارے ملک میں بینک کے مہیا کردہ زر کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اس اہمیت کے پیشِ نظر ہم اگلے حصہ میں بینک کے مہیا کردہ زر پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

کیا بینک "زر" پیدا کر سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب پر بینکروں اور ماہرین معاشیات کے درمیان اختلاف رائے ہے، بینکر کہتے ہیں کہ وہ زر کی مقدار میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کر سکتے، لوگ جتنی رقم ان کے پاس جمع کر دیں، اسی رقم کو بذریعہ چیک کے ذریعہ استعمال کرنے کا انتظام کر دیتے ہیں اور بس۔

ان کا کہنا ہے کہ ہر بینک کو اپنے پاس نقد رکھنا ہوتا ہے تاکہ اس کے گاہک جب بھی چاہیں اس سے اپنی رقم کا مطالبہ کر لیں اب فرض کیجیے کہ الہ آباد بینک میں زید (۱۰۰) روپیہ جمع کرے اور الہ آباد بینک کے مینیجر صاحب (۲۰۰) روپے اس بنیاد پر کسی کو قرض دیدیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ الہ آباد بینک مشکل میں پھنس جائے گا، کیونکہ اگر زید نے آکر فوراً اپنے سو روپیوں کا مطالبہ کیا تو الہ آباد بینک کے پاس اس مطالبہ کو پورا کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوگا۔ دوسری طرف جس شخص نے قرض لیا ہے وہ بھی تھوڑے دنوں کے لئے تو بینک سے روپے کا مطالبہ کر سکے گا۔ بینک اس مطالبہ کو کیونکر پورا کر سکے گا، اور اگر کسی وقت کوئی بینک اپنے گاہکوں کے مطالبات کو پورا نہ کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سب لوگ بینک پر بھروسہ کھو بیٹھیں گے، بینک کا کاروبار ہو نہ سکے گا

کھیل ہے یہ بھروسہ ہٹ گیا تو بنیک کیسے بچے گا۔
اس کے دو جواب ہیں، ایک تو یہ کہ اگر بنیکر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ جتنی رقم ان کے پاس جمع کی جائے اُس سے کئی گنا زیادہ مقدار میں وہ زر اعتبار میں اضافہ کر سکیں تو ایسا کیونکر ہوتا ہے کہ مختلف ترقی یافتہ ملکوں میں زر اعتبار کی مقدار زر قانون سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے؟ اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ امریکہ میں زر اعتبار کی مقدار زر قانونی کے مقابلہ میں کوئی پانچ گنا زیادہ ہے، انگلستان میں بھی زر اعتبار کی مقدار زر قانونی سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔
اب اگر بنیکر یہ اضافہ نہیں کر سکتے تو یہ اضافہ ہوتا کیونکر ہے۔ اس سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنیکر غلطی پر ہیں، اب آیئے ذرا تفصیل سے یہ دیکھیں کہ زر اعتبار وجود میں کیسے آتا ہے، اس طرح ہمیں بنیکروں کی رائے کی تردید کیلئے دوسری دلیل ملے گی۔
فرض کیجئے کہ زید نے الہ آباد بینک میں (۱۰۰) روپے جمع کئے۔ اب اگر پرانے زمانہ کے سناروں کی طرح جو لوگوں کے روپے حفاظت سے رکھنے کا بھی کام کرتے تھے بنیک یہ کل رقم محفوظ رکھے تو ظاہر ہے زر کی مجموعی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ زید نے (۱۰۰) روپے بینک کے پاس جمع کر دئے ہیں اور بینک نے اُسے یہ حق دیدیا ہے کہ جب چاہے اپنی یہ رقم چیک کے ذریعہ بینک سے نکال لے۔ بینک کے پاس یہ امانت محض بینک کی کوشش کا نتیجہ نہیں، اگر زید اپنا روپیہ جمع نہ کرتا تو بینک کے پاس یہ رقم نہ آتی اور جب تک کہ بنیکر سو فی صدی رقم نقد محفوظ رکھیں زر کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا صرف زر کی

شکل بدل جاتی ہے۔ نقد کے بجائے گاہک حساب استعمال کر سکتا ہے۔

لیکن سو فی صدی نقدی محفوظ رکھنے کی بنیکر کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ عملاً کوئی بنیک سو فی صدی زر محفوظ رکھتا ہے۔ بعض ملکوں میں محفوظ سرمایہ رکھنے کے متعلق قانونی پابندیاں ہوتی ہیں اور اس کے لحاظ سے ہر بنیک کو امانتوں کا ایک مخصوص تناسب نقد کی شکل میں رکھنا ہوتا ہے۔ بعض ملکوں میں یہ تناسب قانوناً نہیں بلکہ رواجاً طے ہوتا ہے، چنانچہ انگلستان میں عام طور پر بینک اپنے زر امانت کا دس فی صدی نقدی کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ بینک کا کاروبار دوستی یا خیرات کے ارادے سے تو کیا نہیں جاتا، ہر بنیکر کے سامنے یہ مقصد ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمائے۔ اسے اس کے مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ نقد کے بجائے وہ حکومت کے بانڈ جن پر سود ملتا ہے، یا اسی طرح کی اور دستاویزیں خرید کر رکھ لے اور ان پر تھوڑا سا مزید نفع کمائے۔ اب فرض کیجیے کہ الہ آباد بنیک نے یہ طے کیا کہ وہ دس فی صدی کے لحاظ سے تو رقم محفوظ رکھے گا تاکہ نقد کے مطالبات پورے کر سکے۔ اور باقی ۹۰ روپے سے تھوڑی مدت کیلئے ایسی دستاویزیں خرید لیگا۔ جو آسانی سے نقد کی شکل میں تبدیل کی جا سکیں۔ ان دستاویزوں پر اسے سود ملیگا، اور اسطرح اسکے نفع میں اضافہ ہوگا۔ یہاں ہمیں ایک بات سمجھ لینا چاہیئے۔ ہماری پہلی مثال میں جب زید نے روپیہ جمع کیا تھا تو بنیکر کا اس کام میں صرف اتنا حصہ تھا کہ اس نے زید کے اس ارادے کو پورا کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔ فیصلہ زید کا تھا، لیکن دستاویزیں خریدنے، یا کسی کو قرض دینے کا فیصلہ کرنا بنیکر کا کام ہوتا ہے۔ یہاں فیصلہ کرنا اور عمل کرنا بنیکر کا کام ہوتا ہے۔ زر بنیک کی مقدار میں اضافہ ان دونوں

طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ گاہک روپیہ لاکر جمع کر دے، اور بنیکر اس رقم کو چیک کے ذریعہ استعمال کرنے کا انتظام کر دے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بنیکر خود قرض لینے کا یا مختلف ایسے دستاویز خریدنے کا فیصلہ کرے جن سے اسے کچھ آمدنی ہو۔

اوپر کی مثال میں ہم نے دیکھا ہے کہ الہ آباد بنیک کے پاس کسی نے سو روپے جمع کئے۔ ان میں سے اس نے دس روپے تو نقد کی صورت میں محفوظ رکھ لیے کہ یہ قانوناً ضروری ہے باقی رقم اس نے قرض دے دی یا اس سے دستاویزیں خرید لیں جن پر اسے سود ملے گا۔ اس مثال میں آپ نے دیکھا کہ زر کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ہوا بس یہ ہے کہ سو روپے کی شکل بدل گئی دس روپے تو اب بنیک کے پاس زرِ محفوظ کی حیثیت سے رکھا ہوا ہے، باقی (۹۰) سے بنیک نے ایسی دستاویزیں خرید لی ہیں جو آسانی سے بیچی جا سکتی ہیں۔ یا ایسی چھوٹی مدت کیلئے قرض دیدیا ہے کہ جب بھی ضرورت پڑے ان ۹۰ روپوں کو واپس حاصل کرے گا اور اپنے گاہک کا مطالبہ پورا کر سکے گا، اس مثال سے بھی بنیکروں کی رائے کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ بنیکر ایسی ہی دلیل کی بنیاد پر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ معاشیات کے ماہرین کا یہ خیال کہ بینک نقد کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ زر اعتبار پیدا کر سکتے ہیں غلط ہے،

آیئے اب اس مثال پر ذرا غور کریں۔ سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں الہ آباد بینک اکیلا بنیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کام ایک بنیک اکیلا نہ کر سکتا ہو وہ سب مل کر کر سکتے ہوں۔ اور بنیکروں کی رائے کی غلطی یہی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کام ایک بنیکر نہیں کر سکتا وہ سب مل کر بھی نہیں کر سکتے ہیں۔

اس مثال میں ہم نے دیکھا ہے کہ الہ آباد بینک کے کرتا دھرتا ۹۰ روپے کسی کو قرض دیدیتے ہیں، یا اس کی دستاویزیں خریدتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ الہ آباد بینک نے یہ رقم عمر کو قرض دی۔ عمر نے یہ رقم کسی کام کیلئے قرض لی ہوگی، لیکن فی الحال ہم یہ مان لیتے ہیں کہ وہ اس رقم پر اپنے حق کو صرف اس حد تک استعمال کرتا ہے کہ اسے الہ آباد بینک سے نکال کر بھارت بینک میں جمع کرا دیتا ہے جہاں وہ اپنا حساب رکھتا ہے۔ یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے۔ الہ آباد بینک عمر کو قرض معمولی حالات میں صرف اس شکل میں دیگا جب عمر بینک کے پاس کوئی قیمتی چیز امانتاً رکھدے تاکہ اگر وہ روپیہ ادا نہ کرسکے تو بینکر اس قیمتی چیز کو بیچ کر اپنی اصل رقم حاصل کرسکے۔ بغیر اس طرح کی کسی ضمانت کے بینک قرض نہیں دیگا۔ ضمانت کے طور پر مختلف چیزیں بینک مان لیتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ضمانت کی رقم قانونی سکوں کی شکل میں جمع کی جائے۔ چنانچہ جب بینک اس طرح کی کسی ضمانت کے عوض میں روپیہ قرض دیتا ہے تو زر کی مقدار میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ اس لئے کہ بینکر نے ان چیزوں کو جو زر کے طور پر استعمال نہیں ہوسکتی تھیں بدل کر ایسی شکل دیدی ہے جو اب زر کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بینکر کیمیا گر ہوتا ہے، جو مختلف قسم کی چیزوں کو زر کی شکل دے دیتا ہے، اس معنی میں یہ بات نہیں کہ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہو اور وہ زر کی مقدار میں اضافہ کردے۔ اس غلط فہمی کا دور کرنا ضروری ہے کہ بینکر گویا یہ طاقت رکھتا ہے کہ بغیر کسی چیز کی مدد کے زر کی مقدار بڑھاتا گھٹاتا ہے۔ شاید بینکر جب بینک کے کیمیا گر ہونے سے انکار کرتے ہیں تو وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتے

ہیں کہ ماہرین معاشیات جب انہیں "زر پیدا کرنے" کی قوت کا مالک بتاتے ہیں تو ان کے ذہن میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے کہ بینکر کوئی جادوگر ہوتا ہے، جو جادو کے زور سے بغیر کسی مادی چیز کی مدد کے یا سہارے کے زر کی مقدار بڑھا سکتا ہے۔ بینک مختلف چیزوں کو جو اپنی جگہ پر قیمت رکھتی ہیں لیکن زر کی طرح استعمال نہیں کی جا سکتیں اپنے پاس رکھ کر اپنے گاہکوں کو یہ موقع فراہم کر دیتا ہے کہ وہ بینک سے اتنی یا اس سے کم رقم کے برابر روپیوں کا مطالبہ کر سکیں۔

اب آیئے دیکھیں کہ عمر نے جو ۹۰ روپے الہ آباد بینک سے نکال لئے اور بھارت بینک میں جمع کرا دئیے ہیں ان کا کیا بنتا ہے۔ بھارت بینک کے پاس اب ۹۰ روپے آ گئے ہیں۔ یہ بینک اگر اتنے روپے نقد رکھے تب تو وہ اپنی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عمر سے یہ روپے امانتاً رکھنے کی خدمت کا کچھ معاوضہ لیتا ہو، بینکر چھوٹے عرصہ کیلئے ان کے پاس جو رقمیں رکھی جاتی ہیں ان پر گاہکوں سے کچھ دام لیتے ہیں تاکہ روپے کو امانت میں رکھنے اور حساب کتاب کا خرچ نکل آئے لیکن ان ۹۰ روپیوں پر بھارت بینک کچھ اس سے زیادہ بھی کما سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ الہ آباد بینک کی طرح وہ بھی اس رقم کا کچھ حصہ تھوڑی مدت کیلئے قرض دے دے، یا ایسی دستاویزیں خرید لے جو اسے کچھ سود دلا دیں، اور جنھیں ضرورت پڑنے پر وہ آسانی سے بغیر کسی نقصان کے زر کی شکل میں بدل سکے، بھارت بینک کے کرتا دھرتاؤں کو ۹۰ روپے کی اس آمدنی پر اب یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کیا کریں۔ انھیں قانون معلوم ہے، انھیں سو پر دس کے لحاظ سے نقد اپنے پاس

رکھنا چاہیئے۔ اب اگر اس حساب سے وہ سرمایہ محفوظ رکھنا چاہیں تو ان کے پاس ۸۱ روپے بچ رہتے ہیں، اس لیئے کہ ۹۰ پر انھیں صرف ۹ روپے کے برابر نقد سرمایہ محفوظ رکھنا ہوگا۔ یہ فرض کیجیئے بھارت بنیک کے منیجر صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہ ۸۱ روپے بدلو کو قرض دیں گے، بدلو بھارت بنیک سے روپیہ قرض لیتا ہے، اور عمر کی طرح بھارت بنیک سے نکال کر اپنے بنیک پنجاب نیشنل بنیک میں جمع کر دیتا ہے۔ اب پنجاب نیشنل بنیک کے منیجر کے سامنے یہ سوال ہے کہ اپنی آمدنی میں اضافے کے اس ذریعہ کو کیونکر کام میں لائیں، انھیں بھی یہ معلوم ہے کہ قانوناً انھیں دس فیصدی نقدی رکھنی چاہیئے۔ ان کے پاس بدلو نے ۸۱ روپے جمع کئے ہیں، سو پر اگر نقد دس رکھنا ہوتا ہے تو ۸۱ پر پنجاب نیشنل بنیک کو کچھ اوپر آٹھ روپے محفوظ رکھنے ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب نیشنل بنیک کے منیجر صاحب لگ بھگ ۷۳ روپے (حقیقتاً ۷۲ روپے کچھ آنے) کسی کو قرض دے سکتے ہیں۔ فرض کیجیئے انھوں نے (۷۲) روپے گوپی ناتھ کو قرض دینے کا فیصلہ کیا ہمارے دوسرے بنیکوں کے گاہکوں کی طرح گوپی ناتھ بھی یہ (۷۳) روپے پنجاب نیشنل بنیک سے نکال کر سنٹرل بنیک میں جمع کر دیتا ہے، اب آپ خود ہی بتائیے کہ آگے کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب تو آپ خود ہی نکال لیجیئے۔ یہاں ہم اوپر کی کارروائی کو مختصراً یوں دہرا دیں کہ ساری تصویر سامنے آ جائے تو آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔

اوپر کی مثال میں زید نے الہ آباد بنیک میں سو روپے جمع کیئے جس میں سے

۹۰ روپے بھارت بنیک میں جمع کئے گئے جن میں سے ۹ روپے نقد رکھ کر ۸۱ روپے بنیک نے بدلو کو قرض دے دیئے۔
۸۱ روپے پنجاب نیشنل بینک میں جمع کئے گئے جن میں سے کچھ اوپر آٹھ روپے نقد رکھ کر کوئی ۷۳ روپے بینک نے گوپی ناتھ کو قرض دیدئے۔
اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ بینک کے پاس جو رقم امانتاً رکھ دی جائے وہ زربن جاتی ہے اس لیئے کہ ہم اور آپ یہ رقم چیزوں کی قیمت چکانے یا قرض ادا کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اس مثال میں ان تینوں بنکوں نے زید، عمر اور بدلو کو کتنے روپے چیک کے ذریعہ نکال لینے کا حق دیدیا ہے۔ سَو زید کو ۹۰ عمر کو، ۸۱ بدلو کو ان رقموں کا مجموعہ ۲۷۱ روپے ہوا۔ الہ آباد بنیک کے پاس نقد ۱۰ روپے رہ گئے، بھارت بنیک کے پاس ۹ روپے، پنجاب نیشنل کے پاس کچھ اوپر آٹھ روپے، یعنی ان تینوں بنکوں کے پاس لگ بھگ ۲۷ روپے زر قانونی محفوظ ہے۔ یعنی زر قانونی کی جو رقم ان بنکوں نے اپنے پاس محفوظ رکھی ہے، اس کے دس گنے کے لگ بھگ وہ زر بنیک "پیدا کر چکے" ہیں۔ سَو روپے کی رقم جو زر قانونی کی شکل میں زید نے الہ آباد بنیک کے پاس امانتاً رکھی تھی وہ بڑھ کر ۲۷۱ پر پہونچ چکی ہے، اور ابھی کوئی ۷۳ روپے گوپی ناتھ کے ہاتھ میں ہیں، جو اس رقم کو کسی بنیک کے پاس رکھ دے تو وہ بنیک بھی بھارت یا الہ آباد بنیک کی طرح اس میں سے دس فیصدی کے حساب سے زر قانونی محفوظ رکھ کر باقی قرض دے دیگا، یا کسی اور کام میں لگا دے گا۔ حساب لگانے والے بتاتے ہیں کہ اگر قانون یہ ہو کہ دس فی صدی زر قانونی سرمایہ محفوظ کے طور پر

رکھا جائے تو ہر سو پر ایک ہزار کی رقم وجود میں آجائے گی۔ اگر آپ تھوڑے سے صبر سے کام لیں اور خود حساب لگائیں تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سے بینکوں میں بنٹ کر اتنی رقم واقعی وجود میں آجائے گی، یعنی اوپر ۲۷ روپے زر قانونی کی مدد سے ۲۷۱ روپے کے برابر زر بینک تو وجود میں آگیا جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، اور یہ زر بینک زر قانونی کے دس گنے کے برابر ہے۔

بات سمجھانے کیلئے ہمیں یہ عرض کرنا پڑا تھا کہ عمر اور بدلو جو رقمیں قرض لیتے ہیں، وہ دوسرے بینکوں میں جمع کرتے ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں ظاہر ہے یہ نہیں ہوتا کہ الہ آباد بینک میں روپے جمع کیے جاتے ہوں، اور وہ اس طرح تقسیم ہوتے ہوں جیسے ہم نے اوپر کی مثال میں دیکھا۔ بیک وقت بہت سارے بینکوں میں بہت سارے لوگ بہت سی رقمیں جمع کرتے ہیں، اور ہر بینک اپنے پاس رکھی جانے والی زر امانت سے بھی کام لیتا ہے جو ہمارے بینکوں نے اوپر کی مثال میں کیا۔ ظاہر ہے زر بینک پیدا کرنے میں ایک بینک کے دوسرے بینک پر بھی کچھ مطالبات ہوتے ہوں گے، الہ آباد بینک سے اگر کچھ لوگ اپنی رقمیں واپس لیکر دوسرے بینکوں میں جمع کرتے ہوں گے، تو دوسرے بینکوں سے بھی کچھ رقمیں الہ آباد بینک میں واپس ہوتی ہوں گی۔ اس لئے اس صورت حال سے ہماری تصویر پر کوئی ایسا اثر نہیں پڑتا جس سے وہ بے کار ہو جائے سب بینک ملکر اس زر قانونی سے جو ان کے پاس مجموعی حیثیت سے موجود ہے کئی گنا زیادہ رقم وجود میں لا سکتے ہیں، اس کی شرط صرف یہ ہے کہ ہر بینک کم و بیش ایک ہی

ضروری ہے۔ اوپر کی مثال میں ہم نے دیکھا کہ عمر اور بدلو جو رقم بینک سے قرض لیتے ہیں وہ انھیں نقد کی شکل میں نکال لیتے ہیں، لیکن ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ طریقہ عام طور پر استعمال میں نہیں آتا، ہر بینک کچھ رقم پاتا ہے، اور کچھ اسے ادا کرنا ہوتا ہے۔ اب اگر الہ آباد بینک کو بھارت بینک سے سو روپے ملنے ہوں، اور سو روپے ادا کرنے ہوں تو ظاہر ہے یہ طریقہ بڑا غلط ہوگا کہ پہلے وہ سو روپے بھارت بینک کے پاس بھیجے، اور پھر سو روپے وہاں سے آئیں، بینکوں کی آپس کی لین دین کے لئے اسی دقت کو حل کرنے کی خاطر ایک ادارہ وجود میں آیا ہے جس کو "حساب صاف کرنے کا ادارہ" کہہ سکتے ہیں، ہوتا یہ ہے، کہ ہر بینک جس کا کسی اس طرح کے ادارے سے تعلق ہوتا ہے اپنے کل چیک اس کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اب یہ ادارہ یہ دیکھتا ہے کہ مختلف ممبر بینکوں کو ایک دوسرے کو کتنی رقم دینی ہے، اور کتنی لینی ہے۔ فرض کیجیے الہ آباد بینک کے گاہکوں نے جتنے چیک جمع کیے ہیں اُن کے لحاظ سے اس بینک کو بھارت بینک سے ایک ہزار روپے کی رقم ملنی چاہیے۔ اس کے برخلاف کچھ اور گاہکوں نے اپنے گاہکوں کو چیک کے ذریعہ کچھ رقم ادا کی ہے جو عام طور پر بھارت بینک میں حساب رکھتے ہیں۔ ان چیکوں کی مجموعی مقدار فرض کیجیے (۱۱۰۰) ہے۔ اب الہ آباد بینک کو بھارت بینک کو ادا کرنے ہیں ۱۱۰۰ روپے، اور بھارت بینک کو محض ایک ہزار ادا کرنے ہیں یعنی الہ آباد بینک کو سو روپے ادا کرنے ہوں گے تو جاکر حساب صاف ہوگا۔ "حساب صاف کرنے والا ادارہ" یہ کرے گا ایک ہزار کی رقم تو حساب کے ذریعہ چکتا کر دیگا، اور باقی سو روپے کا الہ آباد بینک سے مطالبہ کرے گا۔

ہوئے تم دیکھا کہ الہ آباد بینک کو زیادہ رقم ادا کرنی پڑی۔ اب اگر یہ صورت برابر جاری رہتی ہے کہ یہ بینک بھارت بینک کو نقد ادا کرنے پر مجبور ہو تو نتیجہ یہ ہو گا کہ الہ آباد بینک کا سرمایہ کم ہوتا جائے گا' اور بھارت بینک کا سرمایہ نقد بڑھتا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں الہ آباد بینک زر بینک کی مقدار میں کم اضافہ کر سکے گا' اور بھارت بینک زیادہ۔ اب اگر بھارت بینک یہ نقد سرمایہ محفوظ رکھنا شروع کردے' اور اس کی بنیاد پر مزید زر نہ'' پیدا کرے'' تو نتیجہ یہ ہو گا کہ دھیرے دھیرے الہ آباد بینک (ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سوسائٹی میں یہی دو بینک کام کر رہے ہیں) کا زر قانونی کا سرمایہ کھنچ کر بھارت بینک میں آجائے گا۔ ظاہر ہے یہ صورت خطرناک ہوگی' اس لئے اس کے آثار پیدا ہوتے ہی الہ آباد بینک کے منیجر صاحب قرض دینے' یا دستاویزیں خریدنے کے کام سے ہاتھ کھینچ لیں گے' تاکہ ان کے بینک کو بھارت بینک کو اس سے زیادہ رقم ادا نہ کرنی پڑے جتنی انھیں اس بینک سے ملنے کی امید ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں بینکوں کو زر کی مقدار میں اضافہ کے کام میں ایک دوسرے کی رفتار کا خیال رکھنا ہو گا۔ اب اگر بینکوں کی تعداد دو کے بجائے چار' (یا اس سے زیادہ ہو جائے) تو اس سے اس اصول پر کوئی اثر نہیں پڑیگا کہ زر بینک میں اضافہ کے کام میں انھیں ایک دوسرے کو دیکھ کر چلنا ہو گا' اگر کسی نے زیادہ تیزی کی تو اس کا زر قانونی کا اثاثہ کم ہونے لگے گا' اور اسے اپنا کاروبار سمیٹنا پڑے گا' اس کے برخلاف اگر کسی نے سستی کی تو دوسرے ساتھی زیادہ نفع کمائیں گے کیونکہ وہ اپنے کل اثاثے پر تھوڑا بہت

سود کما سکیں گے۔ اس کے برخلاف یہ سست رو بینک نقد جمع کیے بیٹھا رہے گا۔ جس پر اسے کوئی آمدنی نہیں ہوگی۔ فرض کیجیے الہ آباد بینک کے علاوہ چار اور بینک سوسائٹی میں کام کر رہے ہیں۔ الہ آباد بینک زیادہ رقم قرض دینے لگتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ اس بینک کے گاہک بہت سارا روپیہ نکالیں گے، جو دوسرے بینکوں میں پہونچے گا۔ دوسرے بینک چونکہ کم مقدار میں قرض دے رہے ہیں اس لیے انہیں الہ آباد بینک کو کم مقدار میں ادائگی کرنی ہوگی۔ الہ آباد بینک کا سرمایہ نقد کم ہونے لگے گا، اور اسے اپنا ہاتھ روکنا پڑے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اگر سب بینک ایک ہی رفتار سے کام کریں تو وہ اس زر قانونی سے جو ان کے پاس محفوظ ہو کئی گنا رقم وجود میں لا سکتے ہیں۔

لیکن اس کام میں چند اور شریک کار ہیں اور زر اعتبار کی "پیدائش" کا پورا عمل سمجھنے کیلئے ان کا ذکر ضروری ہے۔ ہم نے سب سے پہلے تو یہ فرض کیا ہے کہ سب بینک ایک ہی حساب سے زر قانونی نقد کی صورت میں محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن فرض کیجیے ایسا نہ ہو، اور سبھی بینک یہ مناسب سمجھیں کہ قانونی طور پر انہیں جو رقم محفوظ رکھنی چاہیے اس سے زیادہ رکھنا بہتر ہے تو زر محفوظ کے تناسب میں اضافہ ہو جائے گا اور سو روپے کی بنیاد پر جو رقم وجود میں آئیگی وہ ایک ہزار نہیں بلکہ اس سے کم ہوگی، کیونکہ ہر بینک قرض دینے وقت یا کسی کام میں روپیہ لگاتے وقت جو رقم نقد کی صورت میں محفوظ رکھتا تھا وہ اب بڑھ گئی ہے۔

اسی طرح ہم نے بات کو سمجھانے کی خاطر یہ فرض کیا تھا کہ عمر اور بد لوچ

روپیہ قرض لیتے ہیں وہ کُل کا کُل وہ اپنے اپنے بینک میں جمع کر دیتے ہیں۔ یہ مفروضہ بھی حقیقت سے دور ہے۔ قرض لینے کی ضرورت انہیں اس لئے ہی تو پیش آئے گی کہ انھیں کوئی رقم کسی اور کو ادا کرنی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے اور حقیقت سے بہت قریب، کہ اس طرح جو رقم لوگ قرض لیں اس میں سے کچھ تو نقد کی شکل میں نکال لیں، اور باقی اپنے اپنے بینک میں جمع کریں اب مجموعی زر بینک کی مقدار کا تعین کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کتنی رقم مختلف گاہکوں نے نقد کی صورت میں نکال کر ایسے لوگوں کو ادا کی جن کا بینک میں حساب کتاب نہیں ہوتا۔

ایک بات اور بینک زر اعتبار صرف اسی صورت میں "پیدا کر سکتے" ہیں جب کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کے خواہشمند ہوں۔ ہماری اوپر کی مثال میں عمر اور بدلو اگر بینک سے قرض لینے پر آمادہ ہوں تو الہ آباد یا بھارت بینک زر کی مقدار میں اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔ بینک زر اعتبار میں اضافہ دو ہی طرح کر سکتے ہیں، یا قرض دے کر جس میں قرض لینے والوں کا تعاون ضروری ہے، اور دستاویزیں خرید کر جن کیلئے یہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ دستاویزیں بیچ کر نقدی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

ہر بینک پر اس کام میں جو سب سے بڑی پابندی ہوتی ہے وہ یہ کہ اسے کافی مقدار میں نقد سرمایہ زر قانونی کی شکل میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ جب اس سے نقد کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اس مطالبہ کو پورا کر سکے۔ بینک کے وعدے، یا بینک کے چیک خود زر نہیں، اور کوئی بھی انہیں قبول کرنے پر مجبور نہیں۔ زر قانونی ہر صورت میں قبول کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی بینک کسی کو یہ حق دیتا ہے

کہ وہ چیک کے ذریعہ بینک سے کچھ رقم نکال لے تو ساتھ ہی اُسے یہ انتظام بھی کرنا ہوتا ہے کہ کم سے کم اتنا زر قانونی حاصل کرلے جتنا اُس کے خیال میں قرض لینے والا، یا روپیہ جمع کرنے والا گاہک مانگ لیگا یہی وجہ ہے، کہ بنکیر اپنی امانت کی مقدار کا تعین کرنے میں نقد کو جو اُن کے پاس موجود ہو، یا جو وہ آسانی سے حاصل کرسکیں بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن اس سوال کا جواب آسان نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کسی خاص تناسب کا تعین کیونکر ہوتا ہے" آیئے ذرا سی دیر کے لئے ایک فرضی بینک کاری کے نظام کا جائزہ لیں جو ہمارے نظام کی طرح محفوظ ہے، اور جس کی لین دین سال کے تین سو پینسٹھ دن ایکساں ہوتی ہے (جیسا کہ ہمارے نظام میں نہیں ہوتا) تو ایسے بینک کیلئے یہ بالکل ضروری نہیں ہوگا کہ زر قانونی کی چھوٹی سی مقدار بھی محفوظ رکھے۔ کیونکہ چیک کے بدلے میں جو نقد روپیہ ادا کیا جاتا ہے وہ عمر بھر گردش میں نہیں رہتا، وہ بھی گھوم پھر کر تاجروں اور دکانداروں کے ہاتھوں میں سے ہوتا ہوا واپس بینک میں پہونچ جاتا ہے جو اسے بینک میں محفوظ رکھنے کیلئے جمع کردیتے ہیں۔ اس طرح انہیں چیک کے ذریعہ زیادہ روپے نکالنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ کوئی بھی بینک کاری کا نظام زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس میں زر قانونی ہمیشہ باہر نکلتا ہوا بینکوں کے ہاتھ میں نہ آئے لیکن اگر زر قانونی کے آنے اور جانے کا تناسب یکساں ہو، جتنی نقدی بینک کھوئیں اتنی ہی پانے بھی رہیں تو پھر بینکوں کو زر قانونی کا کوئی ذخیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ تصور ممکن ہے کہ کوئی ایسا وقت بھی ہو جب کہ بینکوں کے پاس

ایک پائی بھی اس طرح محفوظ نہ ہو . . . لیکن عملی زندگی میں یہ تناسب یکساں نہیں ہوتا، لوگ جو رقمیں بینک سے نکالنا چاہتے ہیں، اور جتنا جمع کرنا چاہتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہوتیں . . . شاید بینکر ان دونوں کے درمیان تناسب کا تعین تجربہ کی بناء پر کرتے ہوں گے، انہیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتنی رقم کسی خاص مدت میں ان کے ہاتھ آئے گی، اور کتنی ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ وہ جو ذخیرہ محفوظ رکھتے ہیں وہ عموماً ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے" اس تناسب کا تعین، چاہے وہ قانون کی بناء پر کیا گیا ہو یا رواجاً، ایک نہ ایک حد تک من گھڑت سا ہوتا ہے اس میں کچھ تو عادت کو دخل ہوتا ہے، کچھ اس خواہش کو کہ لوگوں کو بینک پر بھروسہ رہے، انگلستان اور یورپ میں بینک خود اپنی سوجھ بوجھ سے یہ تناسب طے کرتے ہیں، لیکن امریکہ میں یہ تناسب قانوناً طے ہوتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں ان دونوں اصولوں کے درمیان ایک طرح کا سمجھوتہ کیا گیا ہے بینک خود اپنے پاس جو سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں اس کا تناسب وہ خود کرتے ہیں، لیکن امریکہ کی طرح ہر بینک کو تھوڑی سی رقم رزرو بینک کے پاس محفوظ رکھنی ہوتی ہے۔

اس آخری بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ابھی تک ہم نے محفوظ سرمائے کی حیثیت سے قانونی زر کا ہی ذکر کیا تھا۔ لیکن بینک اپنا سرمایہ محفوظ قانونی زر کی ہی شکل میں نہیں رکھتے کچھ تو وہ نقد کی شکل میں اپنے پاس

ہندوستان کے بینک لڑائی سے پہلے لگ بھگ چودہ فی صدی سرمایہ محفوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جب اُن کے مجموعی زر امانت کی رقم ۲۳۶٫۶ کروڑ روپے تھی، بینکوں کے پاس نقد کوئی (۶٫۷) کروڑ روپے تھے، اور (۲۵٫۳) کروڑ کی رقم انھوں نے مرکزی بینک یعنی رزرو بینک کے پاس جمع کر رکھی تھی۔ یہ کل محفوظ سرمایہ زر امانت کے ساڑھے تیرہ فی صدی کے برابر تھا۔ آج (۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء) ہمارے بنکوں کے پاس کل امانت کی رقم (۸۷۵٫۴۰) کروڑ روپے ہے۔ بنکوں کے پاس نقد (۳۳٫۸۲) کروڑ روپے ہیں، اور رزرو بنک کے پاس (۷۰٫۳۶) کروڑ روپے کی رقم جمع ہے۔ امانت اور سرمایۂ محفوظ کا تناسب کوئی (۱۱) فیصدی کے قریب ہے۔ زر اعتبار کی پیدائش میں مرکزی بنک ایک اہم حصہ کا مالک ہے۔ اگلے حصے میں ہم مرکزی بنکوں کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔[1]

(فٹ نوٹ) [1] لیکن اس سے پہلے ہمیں بنکوں کے محفوظ سرمایے کے دوسرے حصہ کے (یعنی زر قانونی کے متعلق بھی کچھ جان لینا چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زر اعتبار کی مقدار زر قانونی سے ایک خاص تناسب رکھتی ہے۔ زر قانونی کا اہم ترین جز ہمارے زمانہ میں وہ نوٹ ہیں جو مرکزی بینک چھاپتے ہیں۔ تقریباً سبھی ملکوں میں ان نوٹوں کی مقدار قانوناً طے ہوتی ہے۔ اوپر ہم اس بات کی طرف محض اشارہ کیا تھا، یہاں ان قانونی پابندیوں کا تھوڑا سا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

(۳) مرکزی بینک

اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ بینک کے کاروبار میں مختلف بینکوں کو ایک دوسرے سے لین دین کرنا پڑتا ہے، ہر بینک کو دوسرے بینکوں سے کچھ رقم حاصل ہوتی ہے، اور کچھ اسے دوسرے بینکوں کو دینا ہوتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے یہ کہا ہے کہ اس آپس کی لین دین کا حساب چکانے کیلئے بینک زرِ قانونی سے کام لیتے ہیں، کہیں کہیں ایسا ہوتا بھی ہے لیکن زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ یہ بینکر ایسی رقموں کی ادائگی مرکزی بینک میں اپنی جمع شدہ رقم محفوظ پر چیک کاٹ کر کرتے ہیں۔ یہ طریقہ انگلستان میں ایجاد ہوا، اور اسکی وجہ یہ تھی کہ کوئی ڈیڑھ سو سال سے بینک آف انگلینڈ انگلستان کا سب سے مضبوط اور سب سے مالدار بینک تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بینک بینکوں کا بینک ہو گیا، مجبوری میں قرض دینے والا ادارہ بینک کی اس ساکھ کا طبعی تھا کہ دوسرے تجارتی بینک یہ سمجھنے لگے کہ جب بھی وہ چاہیں اپنی زرِ امانت کرنسی کی شکل میں نکال سکتے ہیں اس لئے وہ ان رقموں کو جو بینک آف انگلینڈ کے پاس امانتاً رکھتے تھے نقد جیسا ہی سمجھنے لگے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں لوگوں نے انگلستان کے اس طریقہ کو اپنا لیا ہے چنانچہ اب بہت ملکوں میں یہ رواج ہے کہ عام بینک اپنا محفوظ سرمایہ کچھ تو زرِ قانونی کی شکل میں اپنے پاس رکھتے ہیں اور کچھ مرکزی بینک کے پاس امانت کی شکل میں۔

مرکزی بینک ایک خاص قسم کا بینک ہے جس کے ذمہ حکومت خاص خاص کام سپرد کر دیتی ہے

ہوتا ہے وہ بھی ایک بینک۔ اور دوسرے بینکوں کی طرح اگر وہ اپنا کاروبار بڑھانا چاہے تو مختلف قسم کی قیمتی چیزوں کے عوض اسے بھی ادائگی کا وعدہ دینا ہوتا ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عام بینک زر کی مقدار میں کس طرح اضافہ کر سکتے ہیں۔ مرکزی بینک بھی ان ہی اصولوں پر چل کر زر کی مقدار کم یا زیادہ کر سکتا ہے۔ مرکزی بینک اگر قرض کی مقدار میں اضافہ کرے، یا بازار سے تجارتی دستاویزیں وغیرہ خریدے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کاموں کے لئے اپنے خزانہ سے چاک کے ذریعہ کچھ رقمیں نکالنے کا حق دیتا ہے۔ یہ رقمیں ظاہر ہے گھوم پھر کر بینکوں کے ہاتھ میں آئیں گی، بینک اگر زر قانونی کا مطالبہ نہ بھی کریں تو بھی اُن کے زر نقد کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ مرکزی بینک کے پاس اپنی امانت کو وہ بالکل نقد کی طرح ہی سمجھتے ہیں۔ اور پھر جب عام بینکوں کی نقدی میں اضافہ ہوگا تو وہ قدرتاً (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) کئی گنا زیادہ زر اعتبار پیدا کر سکیں گے۔ مثلاً اگر مرکزی بینک کسی کو سو روپے قرض دے تو یہ سو روپے جب بینکوں کے ہاتھ میں پہونچیں گے تو وہ ان میں سے دس روپے نقد رکھ کر (۱۰۰) کے برابر مزید زر پیدا کر سکیں گے۔

اس طرح مرکزی بینک کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ وہ چاہے تو عام بینکوں کے پیدا کردہ زر کی مقدار میں اضافہ یا کمی کر دے۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ عام بینک زر کی جو مقدار پیدا کر سکتے ہیں اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ جس کا دارومدار زر کی اس رقم پر ہوتا ہے جو بینکوں کے پاس نقد کی

صورت میں موجود ہو۔ مرکزی بینک پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے۔
یہاں ایک وجہ سے غلط فہمی ہونے کا امکان ہے۔ ہمارے موجودہ سماج میں نوٹ عام طور پر رائج ہیں۔ یہ نوٹ مرکزی بینک کے وعدے ہی ہوتے ہیں کہ ان کے بدلے میں وہ کوئی متعینہ رقم دیگا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ وعدہ در اصل اب محض ایک یادگار ہے کیونکہ نوٹ کے بدلے میں بینک دوسرے نوٹ ہی دیتا ہے۔ اس لئے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ بینک پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اسے زرِ قانونی جاری کرنے کا حق ہوتا ہے، اور اس لئے وہ جتنی رقم چاہے قرض دیسکتا ہے، یا زر کی مقدار میں جتنا چاہے اضافہ کر سکتا ہے۔
پچھلے فٹ نوٹ میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ اس سلسلہ میں مرکزی بینک بالکل آزاد نہیں ہوتے، چنانچہ ہمارا اپنا مرکزی بینک ریزرو بینک اس سلسلہ میں بعض قوانین کا پابند ہے۔ اس لئے زر کی مقدار میں اضافہ کرنیکے سلسلے میں ریزرو بینک پر پابندیاں ہیں۔ زر کی مقدار کے کم کرنے کی بھی حدیں ہیں۔ ظاہر ہے بینک قرض کی اتنی ہی مقدار کم کرسکتا جتنی اس نے قرض کے طور پر دی ہو، بینک کو اپنے مصارف نکالنے ہوتے ہیں اس لئے وہ سب سرکاری یا تجارتی دستاویزیں بھی الگ نہیں کرسکتا۔ اس لئے زر کی مقدار میں کمی کے سلسلہ میں بھی مرکزی بینک پر ایک پابندی عائد ہوتی ہے۔ قانونی پابندیوں کے علاوہ مرکزی بینک پر ایک دوسرے قسم کی پابندی ہوتی ہے۔ مرکزی بینک کو جو خاص اختیارات دیئے جاتے ہیں اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے یہ توقع بھی لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنے عمل سے ملک کی بھلائی کی کوشش کریگا۔ اس لئے

مرکزی بینک، اس سے کہیں زیادہ سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں جتنا کہ عام بینکر رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کو ذہن میں رکھ کر بھی مرکزی بینک کو بہت سی طاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ زر کی مقدار میں بہت کچھ کمی بیشی کر سکتا ہے۔

مرکزی بینک زر کی مقدار میں اضافہ (یا کمی) کیونکر کر سکتا ہے؟ زیادہ قرض دے کر، یا قرض کی شرطوں کو ہلکا کر کے لوگوں کو قرض لینے پر اُبھار کر، یا مختلف تجارتی اور کاروباری دستاویزوں میں روپیہ لگا کر۔ اوّل الذکر صورت پر اثر ڈالنے کیلئے مرکزی بینک کے پاس شرح سود کا ہتھیار ہوتا ہے۔ مرکزی بینک اگر اپنی شرح سود میں کمی کر دے تو عام حالات میں لوگ اس سے زیادہ قرض لیں گے، اس کے برخلاف اگر وہ سود کی شرح میں زیادتی کر دے تو لوگ قرض کم لینا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں دوسرے بینکوں کی طرح مرکزی بینک بھی قرض کے بدلے میں کوئی نہ کوئی ضمانت مانگتا ہے۔ قانون عموماً ان ضمانتوں اور دستاویزوں کی تفصیلات طے کر دیتا ہے کہ مرکزی بینک کس قسم کی دستاویزیں قبول کر سکتا ہے۔ جن دستاویزوں کے قبول کرنے کی اجازت ہو جب کوئی وہ لے کر بینک کے پاس آئے تو بینک قرض دینے سے انکار نہیں کر سکتا لیکن بینک بالواسطہ لوگوں کی ہمت افزائی کر سکتا ہے کہ زیادہ قرض لیں، یا انہیں مجبور کر سکتا ہے کہ کم سے کم قرض لیں۔

عام بینکوں کو نقد فراہم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مرکزی بینک خود دستاویزوں کے خریدنے اور بیچنے کا کاروبار کرے۔ قانون ان کی بھی تفصیلات طے کر دیتا ہے۔ جب مرکزی بینک کوئی دستاویز

خریدتا ہے تو لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کے پاس خریدار کی زرامانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ عام حالات میں یہ کاروبار افراد بلکہ ادارے کرتے ہیں جب ان کی زرامانت میں اضافہ ہوتا ہے تو عام بینکوں کے زرنقد کی مقدار بڑھتی ہے اور اس لئے وہ زیادہ رقم وجود میں لا سکتے ہیں اس کے برخلاف جب مرکزی بینک یہ دستاویزیں بیچتا ہے تو بینکوں کے پاس سے نقدی کھنچ کر مرکزی بینک کے پاس آجاتی ہے جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک جو زر پیدا کرسکتے ہیں اسکی مقدار میں کمی ہو جاتی ہے۔ مرکزی بینک کی اُن کارروائیوں کی کامیابی یا ناکامیابی کی کچھ شرطیں ہوتی ہیں اور ان کے موثر ہونے کی حدیں ہیں لیکن ان حدوں سے ہم آئندہ بحث کریں گے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ بینک پالیسی کے ذریعہ زر کی خرابیوں کو کس حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔ اب ہمیں سب سے اہم سوال کی طرف توجہ کرنا ہوگا کہ زر کی قیمت کیونکر متعین ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے زر کی "قیمت" کے تصور اور کچھ متعلقہ مسائل پر بحث کرنا ضروری ہے۔ اگلے باب میں ہم ان موخر الذکر مسائل سے بحث کریں گے۔ اس کے بعد کے ابواب کا موضوع زر کی قیمت کا تعین، اور اس سلسلے میں مروجہ نظریے ہیں۔

تیسرا باب

زر کی قیمت کا تصور

۱۔ انڈکس نمبر یا اشاریہ

ہم روزمرہ کی زندگی میں مختلف چیزوں کی قیمت کے ناپنے کے لئے زر کو پیمانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، سیب دو روپے سیر اور سنترے ایک روپے کے درجن، اس لئے زر کی قیمت کا تصور کچھ نا آشنا سا تصور معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم زر کے طلب گار اس لئے ہوتے ہیں کہ اس کی مدد سے ہم چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔ کنجوسوں کو الگ کر کے جو زر کو بذات خود جمع کرنا پسند کرتے ہیں ہم زر کو محض اس لئے اہمیت دیتے ہیں کہ زر کی ایک قوت خرید ہوتی ہے۔ زر کی قیمت یہی قوت خرید ہے۔ اگر ایک روپے سے صرف ایک درجن سنترے ہی ملتے، ہماری سماج میں اور کوئی چیز نہ ملتی ہوتی نہ بکتی تو بڑی آسانی سے ہم یہ کہہ سکتے کہ ایک روپے کی قیمت ایک درجن سنترے ہیں۔ قیمت دراصل اس تناسب کا نام ہے جس کے بدلے میں کوئی چیز حاصل کی جا سکتی ہو۔ اس صورت میں ایک درجن سنترے کے بدلے میں ایک روپیہ حاصل کیا جا سکتا اس لئے ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ ایک روپے کی قیمت ایک درجن سنترے، اور ایک درجن سنتروں کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

لیکن ہماری سوسائٹی میں ان گنت چیزیں خریدی اور بیچی جاتی ہیں اور سماج کے مختلف افراد کیلئے مختلف چیزوں کی اہمیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ایسے مزدور کیلئے جو چند آنوں کے عوض دن بھر محنت کرتا ہے ان آنوں کی قیمت کا تصور یہ ہے کہ ان کے بدلے وہ تھوڑا سا آٹا اور تھوڑا سا چاول حاصل کرسکتا ہے، اس سے یہ بتانا کہ ایک روپے سے ایک درجن سنترے خریدے جاسکتے ہیں، یا ایک روپے کی قیمت ایک درجن سنترے ہیں بالکل بے معنی سی بات ہوگی۔ اسکے برخلاف اگر یہ گنایا جائے کہ ایک روپے سے فلاں فلاں (کوئی ایک درجن بھر) چیزیں خریدی جاسکتی ہیں تو پھر یہ تصور بھی تقریباً بیکار سا ہو جائے گا۔ زر کی قیمت کے تصور کی اہمیت یہ ہے کہ ہم اسطرح مختلف جگہوں یا مختلف زمانوں میں قوت خرید کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ سنترے ناگپور میں دو آنے درجن ملیں، اور ناگپور کے لوگ محض سنترے کھاتے ہوں، اور لکھنؤ میں ایک روپیے درجن اور لکھنؤ والے بھی سنتروں پر گزر بسر کرتے ہوں تو اس صورت میں یہ کہنا کہ ایک روپے کی قوت خرید لکھنؤ میں کم اور ناگپور میں زیادہ ہے کوئی معنی رکھے گا۔ اس دقت کو حل کرنے کیلئے کہا جاسکتا ہے کہ سبھی قیمتوں کو شامل کرکے زر کی قیمت یا قوت خرید ناپنے کی کوشش کی جائے، لیکن عام قیمتوں کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسی عام چیزیں جو عام لوگوں کیلئے کوئی اہمیت رکھتی ہیں؟ نہیں۔ لوگ اپنی آمدنی چیزوں کے حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس طرح وہ عام صرف کی چیزیں کھانا کپڑا وغیرہ خریدتے ہیں۔ کچھ اور لوگ جو کاروبار کرتے ہیں روپے کو اور کاموں میں ہی لگاتے ہوں، جیسے غلہ یا شاید

کی خرید، مشینوں کی خرید وغیرہ، اس طرح زر کی اس کے استعمال کے مقاصد کے لحاظ سے ان گنت قیمتیں ہوتی ہیں۔ اِن دقتوں کو ایک من گھڑت طریقے سے عملاً یوں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زر کی تین قیمتیں معیار کے طور پر مان لیگئی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور زر کی وہ قیمت ہے جس کا تعلق اُن اشیا کے داموں سے ہے جو تھوک کے بازاروں میں بکتی ہیں یہ زیادہ تر خام اشیا ہوتی ہیں اور ان کے انتخاب کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کی قیمتیں سب سے زیادہ آسانی سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ یہ اخباروں میں چھپتی ہیں، بازار میں معلوم و مشہور ہوتی ہیں، اسے زر کی تھوک قیمت کا نام دیا جا سکتا ہے، اور سب سے زیادہ مشہور یہی معیار ہے۔

زر کی دوسری معیاری قیمت وہ ہے جس کا تعلق اُن چیزوں کے داموں سے ہوتا ہے جو ایک عام خاندان روزمرہ استعمال کرتا ہے۔ اس قیمت کا پتہ لگانے میں دو طرح کی دقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ معلوم کرنا کہ ایک اوسط خاندان واقعتاً کیا چیزیں استعمال کرتا ہے، جس کے لئے بڑی دردسری کی ضرورت پڑتی ہے، دوسری مشکل یہ ہے کہ جب یہ طے ہو جائے کہ معمولاً استعمال میں کون سی چیزیں آتی ہیں تو ان کی قیمتیں کیونکر معلوم ہوں گیہوں کا بھاؤ تو پورے بازار میں ایک ہوتا ہے، لیکن مثلاً روٹی کا دام جگہ جگہ مختلف ہوتا ہے۔ گوشت کی ان گنت قسمیں اور اس لئے کئی دام ہوتے ہیں، مکان کے کرائے کا تو پوچھنا ہی کیا، جتنی طرح کے مکان ہوں، اُتنا ہی کرائے میں فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی خاندان کے عام مصارف زندگی میں مکان کے کرایہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے اس دقت کو حل کرنے کیلئے یہ کرتے ہیں کہ طرح طرح کی چیزوں کے مختلف دام

معلوم کر کے پھر اُن کا اوسط نکال لیتے ہیں۔ زر کی اس قیمت کو مصارف زندگی کی قیمت کا معیار کہہ سکتے ہیں۔

زر کی تیسری اہم قیمت اس قوت خرید سے متعلق ہے جس کا مزدوروں کو کام میں لگانے میں اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر چیز کی پیداوار میں محنت کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کچھ مزدوروں کی خدمتیں حاصل کی جائیں۔ انھیں اجرت دینی ہوتی ہے، زر کی اس قیمت کا تعین اجرت کی شرح سے ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ظاہر ہے بعض بہت نمایاں دقتیں سامنے آتی ہیں۔ مزدوروں کی ان گنت قسمیں ہوتی ہیں، اور پھر اجرت میں کیا چیزیں شامل کی جائیں، کیا نہ کی جائیں وغیرہ مسائل بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں، ان دقتوں کو عملاً کسی نہ کسی طرح حل کیا جاتا ہے، لیکن اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ " زر کی قیمت کی کوئی قطعی تعریف بہت ہی پیچیدہ کام ہے، اور جہاں بہت سی پیچیدگیاں اور تنوع ہو وہاں تھوڑے بہت من گھڑت طریقوں سے کام لینا ہوتا ہے "۔ زر کی یہ تین قیمتیں عام طور پر کام میں لائی جاتی ہیں، اور کچھ نہ کچھ مفروضات کی مدد سے ان قیمتوں کا ایک تصور قائم کر لیا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہو کہ اس تعریف میں یہ کمزوریاں ہیں تو پھر مختلف زمانے میں یا مختلف جگہوں پر زر کی قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے ان کا معیار کے طور پر استعمال کرنا مفید بھی ہو سکتا ہے۔ اور ان قیمتوں کے تصور کی ضرورت محض قوت خرید کی تبدیلیوں کو ناپنے کے سلسلے میں پڑتی ہے۔

ہم روز اس طرح کی گفتگو سنتے ہیں " روپے کی قیمت گھٹ کر چار آنے رہ گئی ہے "

اور یہ کہنے میں تو شاید ہمیں ذرا سا بھی تکلف نہ ہو کہ لڑائی سے پہلے ایک روپے میں اب سے چار گنی چیزیں ملتی تھیں۔ روز مرہ کی زندگی میں ہم زر کی قیمت کے تصور سے بہت کام لیتے ہیں، جنگ اور جنگ کے بعد کی مہنگائی نے تو اس مسئلے کو ایک عملی اہمیت دیدی ہے۔ مزدوروں کو یہ شکایت ہے کہ چیزوں کے دام بڑھتے جاتے ہیں، اور ان کی مزدوری میں اس مہنگائی کا خیال نہیں رکھا جاتا، چنانچہ لڑائی سے پہلے ان کو جو مزدوری ملتی تھی اب اس سے بھی کم اجرت انہیں ملتی ہے پہلے وہ کم داموں کی وجہ سے بہت سی چیزیں خرید سکتے تھے، جن کا اب مہنگائی کی بدولت ان کے لئے تصور بھی ممکن نہیں رہا۔ ان کی ان مانگوں کی سچائی معلوم کرنا چاہیے تو زر کی قیمت یا قوت خرید کے تصور کے بغیر بات ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی۔ بعض جگہ تو یہ ہوتا ہے کہ مزدوروں کو مہنگائی بھتہ دینے میں کم سے کم زبانی قیمتوں کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اگر مصارف زندگی میں اتنا اضافہ ہو تو مہنگائی بھتہ اتنا ملے گا۔ اگرچہ آج تک مہنگائی بھتے نے شاید کسی بھی ملک میں مہنگائی کا ساتھ نہیں دیا اور ہمارے ہاں تو سرمایہ دار طبقے کے ترجمان اخبارات نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ مزدوروں کی حقیقی قوت خرید، یا دوسرے الفاظ میں مزدوروں کا معیار زندگی لڑائی سے پہلے کے دنوں کے مقابلے میں بڑھنے کے بجائے کچھ گھٹ گیا ہے پھر بھی مہنگائی اور سستی کے تصور کو سمجھنے میں زر کی قیمت کے ان معیاروں کی بڑی اہمیت ہے۔

"لیکن بدقسمتی سے یہ تصور بہت سی نظری دقتوں کا شکار ہے (جن میں سے کچھ کی طرف ہم اشارے کر چکے ہیں) ماہرین ریاضی نے اس مسئلہ پر بڑی بڑی

ورزشیں کی ہیں اور نہ جانے کتنے نکتے نکالے ہیں۔ ایک ممتاز ماہر معاشیات نے جو ریاضی کے بھی ماہر ہیں الجبرا کے ۴۴ طریقوں کا ایک مقابلے کا امتحان لے ڈالا ہے۔ جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ پیچیدہ ہے، یہ مختلف فارمولے زر کی قیمت کی تبدیلیوں کو ناپنے کیلئے استعمال کئے گئے ہیں اور ان طریقوں کے نمبر بعض خصوصیات کی بنا پر دیے گئے ہیں۔ اس چکر میں تو پڑنا مشکل ہے لیکن اس مسئلے کی بعض دقتیں ویسے بھی اہم ہیں اور اسلئے انھیں تھوڑا سا وقت دینا ضروری ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کچھ چیزوں کی قیمتوں میں تبدیلیوں کا ایک ایسا انڈکس (یا اشاریہ) بنا لیا جائے جسے دیکھتے ہی زر کی قیمت کی تبدیلیوں کا اندازہ ہو جائے۔ اس انڈکس میں اضافہ ہو تو سمجھ لیا جائے کہ زر کی قیمت میں کمی ہو گئی کیونکہ اب ان چیزوں کے حاصل کرنے کیلئے زر کی زیادہ مقدار دینی پڑے گی اور اگر کمی ہو تو سمجھ لیا جائے کہ زر کی قیمت میں اضافہ ہو گیا، کیونکہ اب انہی چیزوں کو حاصل کرنے کیلئے زر کی کم مقدار دینی پڑے گی، اس سلسلے میں کچھ تو عملی دقتیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مختلف چیزوں کی صحیح صحیح قیمت معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے، تھوک کی قیمتیں تو آسانی سے معلوم ہو جاتی ہیں، دقت دوسری قیمتوں کے معلوم کرنے میں پیش آتی ہے۔ پھر یہ کہنا دشوار ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی قیمتوں کا باہم مقابلہ کیا جا رہا ہے واقعی وہ ایک ہی چیز بھی ہیں یا نہیں۔ کہیں بس میں بیٹھ کر جائیے تو ٹکٹ کے دام آپ خود کہیں گے وصول ہو گئے، اور کھڑے ہو کر جائیے تو ڈنڈ ٹکٹ کے یہ دونوں دام ایک ہی ہیں؟ لیکن ان دقتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ انڈکس کے بنانے ہو کچھ اور بنیادی دشواریاں بھی ہوتی ہیں۔

اور ہم بتا چکے ہیں کہ زر کی عام قیمت کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زر کی بہت سی قیمتیں ہیں، اور ان کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ زر کو کن مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیئے اشارے کے بنانے میں سب سے پہلے ان مقاصد کا طے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر عام قیمت کا مقابلہ کرنا چاہیں تو پھر ہمیں اس انڈکس میں ہر وہ چیز شامل کرنی چاہیئے جو لوگ خریدتے اور بیچتے ہیں اور چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیئے "عام قیمت" کا تصور ہی من گھڑت تصور رہ جاتا ہے۔ مصارف زندگی کا مقابلہ کرنا ہو تو ہمیں اُن چیزوں کو شامل کرنا چاہیئے جو عام طور پر ان کے استعمال میں آتی ہیں، لیکن اس سلسلے میں یہ بات بہت صاف ہو جانی چاہیئے کہ ہم کس کے مصارف زندگی میں اضافے یا کمی کو ناپنا چاہتے ہیں، یا دوسرے الفاظ میں اس آمدنی کی قیمت۔ خرید سنٹرل ڈیری فارم کے مزدوروں کے مصارف میں کمی یا زیادتی ناپنے والے انڈکس سے علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علموں کے مصارف زندگی کو نہیں ناپا جا سکتا۔ اس وقت کا حل جیسا کہ پروفیسر رابرٹسن نے کہا ہے صرف یہ ہے کہ ہم اپنے تصور کے اس آدمی، یا اس جماعت کو زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنائیں، کیونکہ حقیقی انسانوں کے مصارف کا ایسا انڈکس بنانا جو بالکل بے عیب اور مکمل ہو قطعاً ناممکن ہے لیکن یہاں ہماری دقتیں ختم نہیں ہو جاتیں، باقی دقتیں پروفیسر رابرٹسن کے الفاظ میں سنیئے،

"جب یہ طے ہو جائے کہ کونسی چیزیں انڈکس میں شامل کی جائیں تو پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ مختلف چیزوں کی قیمتوں کے تغیر و تبدل کو کس طرح یکجا کیا جائے کہ ہمارا انڈکس مکمل ہو سکے۔ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ مختلف چیزوں کی قیمت میں فیصد جو تبدیلی ہوتی ہیں کا اوسط نکال لیا جائے اور اسے عام قیمتوں میں فیصد

تبدیلی کا معیار مان لیا جائے لیکن ایک ذرا سی مثال سے یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ حل حل نہیں، جال ہے۔ آسانی کے لیے یہ فرض کر لیجئے کہ ہم نے یہ مان لیا کہ روٹی اور بیر کی مدد سے انڈکس بنانے کو ہم نے سب سے بہتر انڈکس تسلیم کر لیا ہے، اور ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان اس سلسلے میں کیا فرق ہے۔ اب فرض کیجئے کہ اس دوران میں روٹی کی قیمت دگنی ہو گئی ہے اور بیر کی قیمت آدھی۔ اب اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں دونوں قیمتیں سو کے برابر تھیں تو سنہ ۱۹۱۰ء میں روٹی کی قیمت (۲۰۰) ہو گئی اور بیر کی (۵۰) ان دونوں کی قیمتوں کا مجموعہ ہوا (۲۵۰) (سنہ ۱۹۰۰ء میں یہ ۲۰۰ تھا) اور ان کی اوسط قیمت — ہمارا انڈکس — سو سے بڑھ کر اب (۱۲۵) ہو گیا گویا قیمتوں میں ایک چوتھائی کا اضافہ ہوا، اور روپے کی قیمت اتنی ہی گھٹ گئی۔ لیکن اگر ہم سنہ ۱۹۱۰ء میں ان دونوں کی قیمتیں سو سمجھیں تو سنہ ۱۹۰۰ء میں روٹی کی قیمت (۱۵۰)، اور بیر کی قیمت (۲۰۰) ہو گی اس طرح ان کی قیمتوں کا مجموعہ اس دوران میں (۲۵۰) سے گھٹ کر (۲۰۰) ہو گیا اور قیمتوں کا اوسط (۱۲۵) سے گر کر (۱۰۰) ہو گیا یعنی اب "عام قیمتوں کا انڈکس" بجائے ایک چوتھائی بڑھنے کے اس میں ۱/۵ کے برابر کمی ہو گئی۔ اس طرح اگر ہم حساب لگانے کیلئے مختلف سال چنیں تو نتائج مختلف ہو جاتے ہیں جس سال سے ہم مقابلے کا آغاز کریں اسے ماہرین نے "بنیاد" کا نام دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ بنیادی سال کا چننا ایک بڑا مشکل کام ہے۔"

کچھ ماہروں کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنے انڈکس میں کافی چیزیں شامل کر لیں تو اس طرح کے

رد و بدل سے ہمیں قیمتوں کی عام سطح کے رجحان کا پتہ مل جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ عملی زندگی کے لیے کام آنے بھر تو ان تبدیلیوں کی حد کا بھی پتہ مل سکے گا۔ انگلستان کے ایک بہت مشہور انڈکس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے جس میں کوئی (۴۷) چیزیں شامل کی جاتی ہیں۔ پھر اگر یہ بات کافی نہ ہو تو ایک حل اور ہے۔ ہم جس چیز کو خاص طور سے اہم سمجھیں اسے کچھ "وزن" دے سکتے ہیں۔ یا تو اس چیز کی کئی قسموں کے دام شامل کرلیں، اور اس طرح اوسط قیمت میں اس چیز کی اہمیت بڑھ جائے گی، یا پھر اس چیز کی قیمت کو کسی خاص عدد سے ضرب دیدیں جو ہمارے خیال میں اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کردے اور پھر مجموعہ جوڑیں، اور اس کا اوسط نکالیں۔

لیکن کچھ اور ماہروں کا کہنا ہے ـــ اور وہ عجیب عجیب مثالیں دیتے ہیں ـــ کہ یہ توقع خوش فہمی پر مبنی ہے۔ اور اس طرح کے انڈکس سے بہت غلط فہمی کا امکان ہے، خصوصاً اگر ان دو سالوں کے درمیان جن کا ہم مقابلہ کر رہے ہیں حالات میں نمایاں تبدیلیاں ہوگئی ہوں۔ اس لئے آئیے ذرا دیکھیں کہ ہم نے جو ابھی ایک مہمل سا نتیجہ نکالا ہے اس کی وجہ کیا ہے، اور اس سے کیونکر بچا جا سکتا ہے لیجئے اس نتیجے کو ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

	سنہ ۱۹۰۰ء	سنہ ۱۹۱۰ء
روئی	۱۰۰	۲۰۰
بھیڑ	۱۰۰	۵۰
مجموعہ	۲۰۰	۲۵۰
اوسط	(۲) ۲۰۰ = ۱۰۰	(۲) ۲۵۰ = ۱۲۵
اضافہ		۲۵ فیصدی

سنہ ۱۹۱۰ء	کے سنہ ۱۹۰۰ء
۱۰۰	۵۰
۱۰۰	۲۰۰
۲۰۰	۲۵۰
(۲) ۲۰۰ = ۱۰۰	(۲) ۲۵۰ = ۱۲۵
	کمی ۲۰ فیصدی

(۱۹۰۰) میں جن چیزوں پر (۱۲۵) خرچ کرنے ہوتے تھے اب اُن پر (۱۰۰) خرچ ہوں گے
اس لئے " " ۱ " $\frac{۱۰۰}{۱۲۵}$ ۸۰ = ۲۰
" " ۱۰۰ ×
۱۰۰ — ۸۰ = ۲۰

"اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات سُن لیجئے۔ ہمارے ملک میں قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، پہلے تو حکومت نے ان قیمتوں کو اور بڑھنے سے روکنا اپنا مقصد بتایا، پھر جان متھائی صاحب نے نہیں کم کرنے کی ضرورت کا ذکر کیا۔ پچھلے سال کچھ عرصہ تک قیمتیں رُکی رہیں، پھر تھوڑی سی کمی ہوئی، اس بیچ میں روپے کی بیرونی قیمت میں کمی کیگئی اور قیمتیں پھر چڑھ نہ سکیں، اور سال کے ختم ہوتے ہوتے جو کچھ کمی ہوئی تھی نہ صرف وہ ختم ہو گئی، بلکہ پچھلے سال کے مقابلہ میں قیمتیں اور بڑھ گئی ہیں۔ ان قیمتوں میں کمی بیشی کے ناپنے کے لئے سنہ ۱۹۳۹ء کو بنیادی سال مانا جاتا ہے، کچھ عرصہ ہوا کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اب سنہ ۱۹۳۹ء کو بنیادی سال ماننا بالکل بے معنی سی بات ہے، اس لئے کہ جو حالات اسوقت تھے اب وہ کبھی نہیں لوٹیں گے، اس لئے بنیادی سال بدل دینا چاہیے۔ اب اگر سنہ ۱۹۴۹ء کو بنیادی سال مان لیا جائے تو اس برس کی قیمتیں سو کہی جائیں گی، اور اس لحاظ سے اس سال قیمتوں کا انڈکس ۱۱۴ ہوگا، زر کی قیمت میں کمی، چیزوں کی مہنگائی کے مسئلے کا یہ کیسا حسین حل ہے!

"ذرا سا سوچنے سے اس مہمل نتیجے کا سبب معلوم ہو جائے گا۔ دونوں سالوں کو بنیادی سال ماننے سے دو نتیجے اس لئے نکلے کہ ہم دونوں صورتوں میں دو الگ الگ چیزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پہلی مثال میں ہم ایک ایسے مجموعے کے ردوبدل کا مطالعہ کر رہے تھے جس میں اتنی روٹی شامل تھی جو سنہ ۱۹۰۰ء میں (۱۰۰) روپے میں ملتی تھی اور اتنی بیئر شامل تھی جو سنہ ۱۹۰۰ء میں سو روپے میں ملتی تھی۔ دوسری صورت میں ہم اس مجموعے کے ردوبدل کا مطالعہ کر رہے تھے جس میں اتنی روٹی شامل تھی جو سنہ ۱۹۰۰ء میں سو روپے میں ملتی تھی اور اتنی بیئر جو سنہ ۱۹۱۰ء میں سو روپے میں ملتی تھی، اس مثال کو اور واضح کرنے کیلئے قیمتیں بھی فرض کر لیجئے تو اچھا ہو۔ فرض کیجئے سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک روٹی اور ایک گلاس بیئر دونوں چار چار آنے میں ملتی تھیں یعنی ایک اٹھنی دونوں کیلئے کافی تھی، اس صورت میں ایک روٹی کی قیمت سنہ ۱۹۱۰ء میں آٹھ آنے تھی اور ایک گلاس بیئر کی دو آنے اور دونوں چیزیں دس آنے میں مل سکتی تھیں یعنی اس خاص مجموعے کی قیمت ۲۵ فیصدی بڑھ گئی تھی۔ اب فرض کیجئے کہ بجائے سنہ ۱۹۰۰ء کے سنہ ۱۹۱۰ء میں ہم آٹھ آنے ان دونوں چیزوں پر صرف کرتے ہیں ہمیں آدھی روٹی اور دو گلاس بیئر مل سکتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ان دونوں چیزوں پر دس آنے صرف ہوتے تھے، سنہ ۱۹۱۰ء میں محض آٹھ آنے یعنی اس مجموعے کی قیمت ۲۰ فیصدی گھٹ گئی۔ عام قیمت کی تبدیلیوں کو ناپنے کیلئے دونوں پیمانے ٹھیک ہیں، لیکن یہ دونوں شامل کردہ دونوں چیزوں کے خاص تناسب کیلئے موزوں ہیں۔ پہلی مثال میں جو مجموعہ ہے وہ ایسا ہے کہ

دونوں سالوں میں سے پہلے سال میں برابر پیسے خرچ کرنے سے بنتا ہے، دوسرا مجموعہ دونوں چیزوں پر دوسرے برس میں برابر پیسے خرچ کرنے سے بنتا ہے دونوں ہی مجموعے یکساں ہی گھڑت ہیں۔

"اس دقّت کا حل کیا ہو۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ جس سال کو ہم بنیادی سال چنیں اُس برس جو چیزیں خریدی اور استعمال کی جا رہی ہوں اُن ہی کو ہم انڈکس بنانے کیلئے بھی استعمال کریں۔ مثلاً اگر مصارفِ زندگی کے ردو بدل کا پتہ لگانا ہو تو صورت یہ ہے کہ چیزوں کا ایسا مجموعہ بنایا جائے جس میں ہر وہ چیز جو ایک اوسط مزدور خاندان اس برس استعمال کرتا تھا، اتنی ہی مقدار میں شامل کر لیا جائے۔ اب اگر اس کے بعد یہ کیا جائے کہ انڈکس میں ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں ۶۵ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مزدور خاندانوں کو اُن ہی چیزوں کی اتنی ہی مقدار کے لئے جو وہ ۱۹۱۴ء میں استعمال کرتے تھے ۶۵ فیصدی زیادہ خرچ کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ حل بھی پوری طرح کام نہیں دیتا۔ اگر اس مدت میں جس سے ہم بحث کر رہے ہوں بہت بنیادی تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں تو یہ پیمانہ کام دے سکتا ہے، لیکن اگر بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہوں تو پھر یہ طریقہ بھی کام نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے ان چیزوں کا استعمال زیادہ کر دیا ہو جن کی قیمتوں میں کمی ہوئی ہے اور ان چیزوں کو کم استعمال کرنا شروع کر دیا ہو جن کے دام میں اضافہ ہو گیا ہو۔ قیمتوں کے علاوہ چیزوں کے استعمال پر اور اثرات بھی پڑ سکتے ہیں، مثلاً لڑائی کے زمانہ میں چیزوں کے استعمال پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں، ہو سکتا ہے کہ پرانی کچھ چیزیں بازار سے ہی غائب ہو گئی ہوں فیشن میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ ایک چیز جو پہلے کبھی،

مقبول عام تھی مردود قرار پا جائے، ایسی صورتوں میں لوگوں کو جس قسم کی قوت خرید سے کام پڑتا ہوگا، یا جو چیزیں وہ استعمال کرتے ہوں گے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہوں گی، اور اس لئے دونوں سالوں کی قیمتوں کا مقابلہ محض تاریخی حیثیت سے تو دلچسپی کا باعث ہو تو ہو، اس کی کوئی اور اہمیت نہیں ہوگی۔

"اس دقت کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے برس میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہوں اُن کی قیمتوں کی فیصد تبدیلی معلوم کر لی جائے، اور پھر دوسرے برس میں اس مجموعے کی قیمت کی فیصد تبدیلی معلوم کر لی جائے جو اس برس استعمال میں آئے۔ پھر ان دونوں کا اوسط نکال لیا جائے اور اس اوسط کو عام قیمتوں میں تبدیلی کا پیمانہ مان لیا جائے اور اگر ہم اس طرح سے سال سال کی قیمتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے کام لیں اور بہت زیادہ وقفہ بیچ میں نہ آئے تو پھر ایسا انڈکس بن سکتا ہے جس کی مدد سے زر کی قیمت کی تبدیلیوں کا خاصا اچھا اندازہ ہو سکے گا۔ مثلاً اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم معلوم کر سکیں کہ سنہ ۱۹۵۱ء کی قیمتیں سنہ ۱۹۵۰ء سے ۲۰ فیصدی زیادہ تھیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے ریاضی دانوں نے اور بھی فارمولے بنائے ہیں۔ ان میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہمیں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ کسی انڈکس سے عملی زندگی کی ہو بہو تصویر سامنے آجائے۔

"دو الگ مقامات پر زر کی قیمت کو ناپنے کی کوشش میں بھی اسی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دو ملکوں میں جو چیزیں عام استعمال میں آتی ہوں وہ مختلف ہو سکتی ہیں، مختلف چیزوں کی اہمیت الگ الگ ہو سکتی ہے اور اس لئے کسی ایسے مجموعے کی قیمت ناپنا جو دونوں کے لئے ایک سی اہمیت رکھتا ہو ناممکن سا ہے۔

اس کُل گفتگو کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ تو عملاً اور نہ نظری حیثیت سے زر کی قیمتوں میں تبدیلیوں کو ٹھیک ٹھیک ناپا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زر کی قیمت میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اگر کوشش کی جائے تو عملی زندگی میں کام آنے کیلئے ایسے پیمانے ضرور بنائے جا سکتے ہیں جن کی مدد سے اس قیمت کو موٹے طور پر ناپ لیا جا سکے۔ بیشتر ملک اب زر کی قیمتوں کو ناپنے کیلئے مختلف انڈکس استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تھوک قیمتوں کے انڈکس میں برطانوی بورڈ آف ٹریڈ کوئی (۱۵۰) چیزوں کی قیمت شامل کرتا ہے، امریکن بیورو آف لیبر (۵۵۰) چیزوں کی قیمتوں کی مدد سے ایک انڈکس شائع کرتا ہے۔ اور موجودہ پریکٹس یہ ہے کہ انڈکس میں مختلف چیزوں کو "وزن" دیا جاتا ہے، تاکہ انڈکس کو زندگی سے زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جائے۔ اس "وزن" کو بدلتے رہتے ہیں تاکہ تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے۔ چنانچہ امریکن بیورو آف لیبر اپنے "وزن" ہر دوسرے برس دہراتا رہتا ہے۔

۲- کچھ زر کی قیمتوں میں تبدیلیوں کے متعلق

اوپر کی گفتگو میں ہم نے زر کی قیمت کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، پھر اس تصور کو ناپنے کی دقتیں بیان کی ہیں۔ اب ہمیں کچھ باتیں ان تبدیلیوں کی نوعیت اور ان کے اثرات کے متعلق جان لینا چاہیئے۔ زر کی کتابوں میں، اور زر سے متعلق مسائل میں چند اصطلاحیں بہت سامنے آتی ہیں، اس لئے انہیں سمجھ لینا ضروری ہے، افراط زر اور زر کی کمی، جیسا کہ کراؤتھر نے کہا ہے مختلف مصنف ان اصطلاحوں کی الگ الگ تعریفیں کرتے ہیں، ایک سادہ اور آسان سی تعریف جو خود کراؤتھر نے کی ہے ہمارے لئے کافی ہوگی۔ افراط زر اس حالت کو کہہ سکتے ہیں جب عام قیمتوں کی چیزیں بڑھ رہی ہوں اور اس لئے زر کی قیمت گھٹ رہی ہو، زر کی کمی کی حالت وہ ہوگی جب عام قیمتیں گھٹ رہی ہوں اور اس لئے زر کی قیمت بڑھ رہی ہو۔

اب سے ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک معاشیات کے ماہر قیمتوں کو بہت زیادہ توجہ کا مستحق سمجھتے تھے، عام خیال یہ تھا کہ قیمتیں کساد بازاری کا سبب ہوتی ہیں، اب قیمتوں کو یہ اہمیت حاصل نہیں رہی، اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قیمتوں کی کمی خود اثر ہے کسی اور سبب کا، یہ سبب جو کچھ بھی ہو وہ روزگار پر اثر ڈالتا ہے، اور روزگار میں کمی اور قیمتوں کی کمی ایک ہی سبب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کلاسیکل اسکول کے نزدیک قیمتوں کی کمی بیشی پر ایک اثر زر کا پڑتا تھا، ان کا خیال تھا کہ جہاں تک قیمتوں کی عام سطح کا تعلق ہے یہ زر کی مقدار، بازار کے اثرات سے مقرر ہوتی ہے، باقی اور مسائل

وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے اسباب حل کر دیتے ہیں۔ ایک حد تک یہ بات صحیح بھی تھی کہ زر کا تمام قیمتوں پر اثر پڑتا ہے۔ عام زندگی کے تجربہ سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ کوئی نہ کوئی سبب ایسا ہے جو سبھی قیمتوں پر یکساں اثر ڈالتا ہے، ہر چیز کی قیمت اُس کی اپنی طلب و رسد کے حالات سے متعین ہوتی ہے، اس لئے خیال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ہر چیز کی طلب و رسد کے حالات الگ ہوں گے اس لئے قیمتوں میں بھی الگ الگ طرح کی تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن جب عام رجحان ایک طرف ہو یا جب قیمتیں بڑھ گھٹ رہی ہوں تو ایسی چند ہی قیمتیں ملتی ہیں جو اس عام رجحان کے خلاف ہوں۔ قیمتوں کے اس برتاؤ کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ کوئی چیز معاشی نظام کی کارکردگی میں ایسی ہوتی ہے جو سب پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے اور چند ہی چیزیں اس کے اثر سے اپنی کچھ خصوصیات کی وجہ سے آزاد رہتی ہیں، اور قیمتوں کی عام سطح اسی اثر سے متعین ہوتی ہے۔ یہ مشترک عنصر زر کا ہی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ قیمتوں میں یہی جزو مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکل اسکول کے نزدیک نظریۂ زر کا اہم ترین سوال یہ تھا کہ یہ پتہ لگایا جائے کہ زر کی قیمت کیوں کر طے ہوتی ہے۔ ان کی بحث و گفتگو کا کُل موضوع یہی تھا۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں میں قیمتوں پر سے توجہ ہٹ سی گئی ہے اور بحث کا موضوع خوش حالی اور کساد بازاری کا چڑھاؤ اُتار ہے، اور اس سلسلے میں زر کا کیا حصہ ہوتا ہے، یہ پتہ لگانا نظریۂ زر کا اہم مقصد ہے، اس لئے ہمیں معاشی خوش حالی اور کساد بازاری کے متعلق تھوڑا بہت جان لینا چاہئے تاکہ مسئلے کی نوعیت ذہن میں آجائے۔

خوش حالی اور کساد بازاری کے اس ردوبدل کو اُتار چڑھاؤ یا مدوجزر

کا نام دینا بہت مناسب ہوگا، کیونکہ معاشی نظام کی کارکردگی میں یہ اُتار چڑھاؤ بہت نمایاں ہیں، روزگار اور قیمتوں میں ردوبدل میں ایک خاص طرح کی باقاعدگی ملتی ہے، تھوڑی مدت تک قیمتیں اور روزگار دونوں میں ہی اضافہ ہوتا ہے، پھر قیمتیں اور روزگار دونوں ہی گرنے لگتے ہیں، پھر یہ اتار کچھ مدت تک قائم رہتا ہے۔ اس پورے چکر کی مدت میں بڑی یکسانیت ملتی ہے، اس میں پانچ سال سے کم نہیں لگتے، اور دس سال سے زیادہ کی مدت اتفاقاً ہی لگتی ہے، کوئی چکر دوسرے سے پوری طرح ملتا جلتا نہیں ہوتا، اس لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ معاشی نظام کی خوش حالی اور کساد بازاری کسی چکر، یا باقاعدہ دور کی پابند نہیں ہیں لیکن تاریخی شہادت اس رائے کے حامیوں کے خلاف ہے اس صورت کو اسی لیے انگریزی میں ٹریڈ سائکل کا نام دیدیا گیا ہے۔

" خوشحالی اور کساد بازاری کا مدوجزر ایک مسلسل ہی بات ہے، اور اس لیے یہ کہنا کہ ٹریڈ سائکل کا آغاز کب ہوتا ہے ممکن نہیں لیکن اسے سمجھنے کیلئے مناسب ہوگا کہ اس کے حصے کر دیئے جائیں اور اس وقت کو جب قیمتیں حد سے زیادہ گر چکی ہوں اور بے روزگاری شباب پر پہونچ چکی ہے نقطہ آغاز بنا کر پھر خوش حالی کے دور کی ایک تصویر کھینچ جائے۔ ایسا کیجیے تو دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ دھیرے دھیرے، غیر محسوس طریقے پر رجحانات میں تبدیلی ہوتی ہے، قیمتیں گرنی بند ہوجاتی ہیں اور کچھ اضافہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس وقت چونکہ ہمارے سامنے مقصد صرف ٹریڈ سائکل کی ایک مکمل تصویر پیش کرنا ہے اسلئے

اس سوال سے ہم بحث فی الحال ملتوی کئے دیتے ہیں کہ ایسا ہوتا کیوں ہے۔ بس اس وقت تو ہمیں یہ جان لینا ہے کہ حقیقتاً ہوتا ایسے ہی ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو خود بخود کچھ ایسے عنصر پیدا ہو جاتے ہیں جو اس نئے رجحان کو تقویت پہونچاتے ہیں۔ قیمتوں کا گرنا بند ہونا خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اب قیمتوں کے گرنے کی حد گزر چکی ہے اور اب اس سے نیچے قیمتیں نہیں جائیں گی۔ اور لوگ جو ابتک اس امید میں کہ قیمتیں ابھی اور گریں گی چیزیں خریدنے سے پس و پیش کر رہے تھے، اب خریدنا شروع کر دیتے ہیں، جب چیزوں کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے تو پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور بے روزگار لوگوں کو ان چیزوں کے بنانے کے سلسلے میں کام مل جاتا ہے جن کی مانگ اس طرح اچانک بڑھ گئی ہو۔ قیمتیں گرتی ہیں تو نفع میں کمی ہوتی ہے، اس لئے جب قیمتوں کا گرنا بند ہو جاتا ہے، تو مل مالکوں کو پھر سے بھروسہ ہونے لگتا ہے کہ اب اگر وہ اپنے اندوختہ کو کام میں لگائیں، یا قرض لیکر کاروبار کریں تو انہیں نفع ہوگا۔ اس لئے اب وہ نئی مشینیں خریدنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، پرانی مشینوں کی مرمت میں جو سستی ہو رہی تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح ان صنعتوں میں بھی کام بڑھ جاتا ہے جن کا کام اشیائے اصل کا پیدا کرنا تھا۔ بے روزگار لوگ جنہیں اب پھر کام مل جاتا ہے اب کچھ کمانے لگتے ہیں، اپنی آمدنی سے وہ کھانا کپڑا حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں، کھانے، کپڑے وغیرہ کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے پھر وہ لوگ بھی، جو بے روزگاری کے دنوں میں اس ڈر سے ہاتھ روک روک کر خرچ کر رہے تھے کہ کہیں انہیں بے روزگاری کا سامنا نہ کرنا پڑے اب اطمینان کا سانس لینے لگتے ہیں

اور طرح طرح کی چیزوں کے خریدنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ان مختلف طریقوں سے مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے، مانگ بڑھتی ہے تو چیزوں کی قیمتوں میں بھی اضافے ہوتے ہیں اور پیداوار بڑھتی ہے، پیداوار میں اضافے سے بے روزگاری میں کمی ہوتی ہے، دھیرے دھیرے وہ دور بھی آسکتا ہے جب محض مشینوں کی مرمت، تھوڑے بہت رد و بدل سے کام نہ چل پائے، اور نئے کارخانے کھولنا ضروری ہو جائے کیونکہ اس کے بغیر چیزوں کی بڑھتی مانگوں کو نہیں پورا کیا جا سکتا، اس طرح مشین بنانے والی صنعتوں کی پیداوار کی مانگ بڑھتی ہے اور کچھ اور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ انہیں روزگار حاصل ہو جاتا، اس طرح دھیرے دھیرے بے روزگاری کی لعنت سے معاشی زندگی کو "صحت" حاصل ہونے لگتی ہے، ہر قدم پر مریض کو نیا سہارا مل جاتا ہے، اور وہ پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بے روزگاری کا دور ختم ہوتا ہے تو خوش حالی کئی برس تک باقی رہتی ہے۔

" اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب اصلاح حال کی ساری قوتیں اپنا زور ختم کر چکی ہوتی ہیں قیمتیں بڑھنی بند ہو جاتی ہیں اور بے روزگاری کم ہونی بند ہو جاتی ہے، اور جب یہ وقت آجاتا ہے تو وہ تمام باتیں جو اصلاح حال میں مدد دے رہی تھیں اس کے برخلاف اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں قیمتوں میں اضافے کے بجائے جب کمی شروع ہو جاتی ہے تو تاجر یہ سوچتے ہیں کہ سامان کچھ ٹھہر کر کیوں نہ خریدیں تاکہ مال اور سستا مل سکے جب وہ چیزوں کے خریدنے میں کمی کر دیتے ہیں تو قدرتاً ان کی مانگ کم ہو جاتی ہے اور پیداوار میں کمی ناگزیر ہو جاتی ہے جس سے

نتیجے کے طور پر کچھ نہ کچھ مزدور روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان کی آمدنی میں کمی
ان کی قوتِ خرید کو کم کر دیتی ہے۔ وہ چیزیں خریدتے تھے انکی مانگ کم ہو جاتی
ہے، اور ان کی پیداوار میں بھی کمی ہو جاتی ہے، جس سے کچھ اور مزدور بیکار ہو
جاتے ہیں، مختلف چیزوں کی مانگ میں کمی سے ان صنعتوں پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے
جو مشینیں اور اس طرح کی چیزیں بناتی ہیں کیونکہ اب لوگ پرانی مشینوں کو نہیں بدلتے
نئی مشینیں نہیں خریدتے، اور ان صنعتوں کی پیداوار کی مانگ میں کمی سے ان صنعتوں کے
مالک بھی اپنا کاروبار کم کرتے ہیں، کچھ اور مزدور اب روزگار سے محروم ہو جاتے ہیں
اور اسی طرح عمل اور ردِّ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزگار میں کمی کے رجحان کو ہر ہر قدم پر
تقویت پہونچتی ہے " صحت " کی طرح کساد بازاری کئی سال تک خود اپنی پیدا کردہ
قوتوں کے سہارے قائم رہتی ہے "

اوپر کی تصویر جو کراؤتھر سے لی گئی ہے خود کراؤتھر کے بقول بہت ہی نامکمل ہے
لیکن چونکہ مقصد محض اس کساد بازاری اور خوش حالی کے چکر کی نوعیت کی وضاحت
تھا اس لئے جہاں تک ہمارے مقصد کا تعلق ہے وہ اس طرح پورا ہو گیا ہے۔ اب جو
سوال رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اس مسئلے کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہو گئی ہے۔ سرمایہ داری کے
دوست اور دشمن دونوں سرمایہ داری کی اس خصوصیت پر بہت زور دیتے ہیں، کمیشن نے
سرمایہ داری کے خلاف جو دو بڑے الزامات لگائے ہیں اُن میں ایک یہ ہے کہ
اس نظام کے تحت روزگار کی مقدار بہت غیر یقینی ہوتی ہے، ابھی روزگار کی
بہتات ہے، ہر شخص روزی سے لگا ہوا ہے ابھی بے روزگاری کا دور دورہ شروع

نظریں جم گئی ہیں، اور تقریباً سبھی یہ ماننے لگے ہیں کہ اگر اس صورت حال کا علاج نہ ہوا تو کساد بازاری اور خوش حالی کا یہ چکر اور بھی شدید ہو جائے گا۔ چنانچہ کراؤ تھر نے اپنی ایک کتاب میں اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ مستقبل میں سرمایہ دارانہ نظام کی یہ خصوصیت اور بھی نمایاں ہو جائے گی جہاں تک سرمایہ داری کے مخالفوں کا تعلق ہے وہ اس بے قاعدگی کو سرمایہ داری کی ناگزیر خصوصیت سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ مرض لاعلاج ہے پچھلے کچھ سالوں میں اس خصوصیت کے اسباب کا تجزیہ مارکس کے نقطۂ نظر سے کافی قریب آگیا ہے، لیکن یہ سوالات ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔

خوش حالی اور کساد بازاری کے اس چکر پر اتنی توجہ ان نقصانات کی بدولت دی جانے لگی ہے جو اس بے قاعدگی سے سوسائٹی کو پہونچتے ہیں بے روزگاری سے جو کساد بازاری کا ناگزیر نتیجہ ہے (یہاں برسبیل تذکرہ یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ذرائع کو پوری طرح کام میں شاذو نادر ہی لایا جاتا ہے یہ خصوصیت عارضی بے روزگاری سے قطع نظر سرمایہ داری کی ایک بنیادی کمزوری ہے) بے روزگاری سے ایک تو یہ ہوتا ہے کہ سماج کے ذرائع ضائع جاتے ہیں، بے کار مزدور کام پر لگ جاتے تو بہت سی چیزیں بنتی اور سماج کی دولت میں اضافہ ہوتا، بے روزگاری سے اس دولت کا وجود میں آنا ناممکن ہو جاتا ہے اس کے علاوہ بے روزگاری سے دوسری بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں بے روزگار مزدوروں کو جو مشقت اور مصیبت اٹھانی پڑتی ہے اس کا بیان کرنا

ضروری نہیں، وہ ہر شخص خود بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ کساد بازاری کے دنوں میں جو دقتیں بے روزگار مزدوروں کو اٹھانی پڑتی ہیں اُن کی تلافی خوش حالی کے دنوں میں ہو جاتی ہوگی۔ ایک حد تک یہ رائے صحیح بھی ہے۔ لیکن عام مزدوروں کا معیار زندگی یوں بھی بہت پست ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عام آمدنیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ مزدوروں کے پاس عام طور پر پس ماندہ دولت نہیں ہوتی جس سے وہ بے روزگاری کے دنوں میں اپنا یہ پست معیار زندگی بھی برقرار رکھ سکیں اس لئے بیروزگاری کے دنوں میں انہیں معمولی معمولی ضرورتوں کے سلسلے میں، جیسے کھانا کپڑا اور مکان وغیرہ، پریشان ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ خوش حالی کے دنوں میں جو تھوڑی بہت سہولتیں ملتی ہیں اُن سے ماضی کے مصائب کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس سے الگ خوش حالی کا حد سے گزر جانا ہی کساد بازاری کا سبب ہے، اس لئے اگر اس چکر کو ختم کر کے ایسا انتظام کر دیا جائے کہ پیداوار اور روزگار کی مقدار میں یہ اونچ نیچ، کمی و بیشی نہ ہو۔ اور ہر شخص کو جو کام کر سکتا ہے کام مل جائے تو وہ بہتر انتظام ہوگا۔ سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔ مخالفوں کی رائے میں یہ ناممکن ہے۔ یہ بحث بہت طویل ہے۔ لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ تاریخی شہادت سرمایہ داری کے حامیوں کے خلاف ہے۔ تاریخ میں ایسے موقع چند ہی ملتے ہیں جب سرمایہ دار ملکوں نے پوری طرح اپنے ذرائع سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ہر شخص کو کام مل جانے کا انتظام ہو سکا ہے اور یہ مواقع جنگ سے پہلے جنگ کی تیاریوں کی بدولت ملے ہیں اور بس۔ سرمایہ دار ملک کسی کے بقول، موت کے سامان فراہم کرتے ہیں تب کہیں جا کر لوگوں کی

روٹی کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اسے حل نہیں کہہ سکتے کہ ہر پچیسویں برس ایک عالمگیر جنگ لڑی جائے تاکہ سرمایہ دارانہ نظام پوری طرح اپنی کارکردگی دکھا سکے۔ اس کے برخلاف روس نے اس مسئلے کو امن کے زمانہ میں تعمیری کاموں کے ذریعہ

حل کیا ہے۔

خوش حالی کے زمانے میں چیزوں کی قیمتیں بڑھتی ہیں اور زر کی قیمت گھٹ جاتی ہے، جب کساد بازاری آتی ہے تو عام قیمتیں گھٹتی ہیں اور زر کی قیمت بڑھتی ہے، زر کی قیمت کے اس ردوبدل سے سوسائٹی کی مختلف جماعتوں پر مختلف اثرات پڑتے ہیں۔ ان سے بحث کرنا ضروری ہے کیونکہ زر کی ان خرابیوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کینس کی طرح سماج کو مختلف حصوں میں بانٹ دینا، اور پھر ان پر زر کی قیمتوں کے ردوبدل کے اثرات کیا ہوتے ہیں؛ یہ معلوم کرنا بہت مناسب ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن میں رکھنی ضروری ہے یہ ہے کہ زر کی اہمیت محض اس لئے ہے کہ اس کی مدد سے ہم بہت سی چیزیں حاصل کرسکتے ہیں اس لئے اگر زر کی قیمت پر کوئی ایسا فرق پڑے کہ اس کا اثر سب پر یکساں ہو، یعنی اگر سبھی قیمتیں ایک ہی تناسب سے بڑھیں یا گھٹیں تو زر کی قیمت میں ردوبدل کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوگی۔ مثلاً اگر سبھی چیزوں کے دام میں دگنے کا اضافہ ہوجائے تو ہم میں سے ہر ایک کی آمدنیاں دگنی ہوجائیں گی، اور ہمیں ہر چیز کیلئے دگنا دام دینا ہوگا۔ ہماری زندگی پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بس اتنا ہوگا کہ جہاں ہمیں ایک روپیہ دینا پڑتا تھا وہاں اب دو روپے دینے ہوں گے،

لیکن عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا کہ سبھی قیمتیں ایک ہی طرح متاثر ہوں، کوئی قیمت بہت زیادہ گرجاتی ہے کسی میں تھوڑی ہی کمی ہوتی ہے، مثلاً زرعی پیداوار کی قیمت میں بہت زیادہ کمی ہوتی ہے، صنعتی چیزوں کے دام اتنے نہیں گرتے، اسی طرح سبھی لوگوں کی آمدنیوں پر زر کی قیمت میں ردوبدل کا اثر ایک ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے سوسائٹی کے مختلف افراد اور مختلف جماعتوں پر زر کی قیمت میں ردوبدل کے مختلف اثرات پڑتے ہیں۔

جیسا کہ کینس نے کہا ہے، سوسائٹی کی موجودہ تنظیم میں مفاد اور سماجی حیثیت کے اختلاف کی روشنی میں سوسائٹی کو تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں پہلے طبقہ میں تو ہم سرمایہ لگانے والوں کو رکھ سکتے ہیں، دوسرا طبقہ کاروباری لوگوں کا اور تیسرا تنخواہ یا مزدوری پانے والوں کا ہوتا ہے جہاں تک افراد کا تعلق ہے انہیں اس طرح ان طبقوں میں بانٹنا مشکل ہے کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک آدمی بہ یک وقت سرمایہ کار بھی ہو اور کاروبار بھی کرے، لیکن طبقات کا یہ تعین عملی زندگی کی کافی سچی تصویر ہے۔

سرمایہ کاری (INVESTMENT) کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کے تحت وقت گزرنے پر کچھ متعین رقموں کی واپسی یا ادائگی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زر کی قیمت مستحکم ہوتی ہے، اور وقت کے ساتھ اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی اس کا سب سے اہم مظہر وہ معاہدے ہوتے ہیں جن میں کچھ مدت گزر جانے کے بعد کوئی متعین رقم واپس کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ حکومت کو طویل مدت کیلئے

قرضے اور رہن وغیرہ بہت ہی پرانی باتیں ہیں اور شاید زر کے قرض لینے دینے کے ساتھ ساتھ ہی ان کی ایجاد ہوئی ہوگی، اٹھارویں صدی میں اسکی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ حکومت کو بڑی مدت کیلئے قرض دیتے تھے، کچھ پرائیویٹ کمپنیاں، جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی، بھی عام لوگوں سے قرض لیتی تھیں، لیکن " انیسویں صدی میں ان کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور بیسویں صدی میں تو دولت مند دو حصوں میں بٹ گئے، سرمایہ کار اور کاروبار کرنے والے لوگ جن کے باہمی مفاد میں تھوڑا بہت تضاد پیدا ہوگیا۔ افراد کی تقسیم اتنی واضح نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ایک ہی فرد اب بھی ان دونوں حیثیتوں میں دیکھا جاسکتا تھا لیکن یہ تقسیم پھر بھی بہت واضح تھی، اس نظام کے عروج کی بدولت کاروبار کرنے والوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے کام کیلئے نہ صرف اپنا سرمایہ استعمال کرسکتے تھے، بلکہ وہ اُن لوگوں سے بھی قرض لے لیتے تھے جو خود کاروبار سے براہِ راست دلچسپی نہیں رکھتے تھے، دوسری طرف روپے پیسے والے لوگوں کو اسکی سہولت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنا اندوختہ مختلف کاروبار میں لگادیں جس کے انتظام کا دردسر انہیں بالکل نہیں برداشت کرنا پڑتا تھا اور انہیں کچھ اور دولت کمانے کا موقع مل جاتا تھا۔ ہلدی لگتی تھی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا ہوتا تھا، موجودہ معاشی نظام میں ایسے لوگوں کی خاصی اہمیت ہے جو سرمایہ کاری پر بسر کرتے ہیں۔ انہیں " غیر حاضر مالک " کہا جاسکتا ہے، یہ طبقہ گنتی میں بہت بڑا اور کافی طاقتور ہے جو ذاتی یا موروثی اندوختوں کی آمدنی پر عیش کرتا ہے۔

زر کی قیمت میں تبدیلی سے اس پر بہت اثر پڑتا ہے کہ سماج کی دولت یا پیداوار کا کتنا بڑا حصہ کس طبقے کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے، اور اس طرح سماج میں دولت کی تقسیم پر بہت نمایاں اثر پڑتا ہے۔ جب چیزوں کی قیمت میں بہت کمی ہو جائے، یا بالفاظ دیگر زر کی قیمت بڑھ جائے تو اس طبقے کو بہت فائدہ پہونچتا ہے کیونکہ اس کی آمدنی میں کمی نہیں ہوتی اور اس آمدنی کی قوت خرید بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جب قیمتیں بڑھتی ہیں اور زر کی قیمت گھٹ جاتی ہے تو اس طبقے کو نقصان پہونچتا ہے کیونکہ اس کی آمدنی جوں کی توں قائم رہتی ہے اور اس آمدنی کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے شخص کو لے لیجئے جس نے تین فیصدی شرح سود پر کسی کو قرض دیا ہو۔ اب اگر قیمتوں میں اضافہ ہو جائے تو بھی معاہدے کی اس شرط میں تبدیلی نہیں ہوگی کہ شرح سود تین فی صدی ہو، پہلے اس تین روپے سے جتنی چیزیں حاصل کی جا سکتی تھیں وہ اب حاصل نہیں ہو سکتیں کیونکہ چیزوں کے دام بڑھ گئے ہیں اور تین روپے کی قیمت قدرتاً گھٹ گئی ہے۔ پھر جتنی رقم اُدھار لیگئی ہو اب جب وہ واپس کی جائے گی تو اس کی حقیقی قوت خرید زیادہ ہوگی مثال کے طور پر اگر کبھی آپ نے کسی سے سو روپے قرض لئے تھے جب ان سَو روپوں سے کل دس چیزیں خریدی جا سکتی تھیں اور اب قیمتیں اچانک گر جائیں اور ان سو روپوں سے وہی چیزیں سَو کی تعداد میں خریدی جا سکیں تو ظاہر ہے آپ نے جتنی چیزیں پہلے اس کی مدد سے حاصل کی تھی اب اس سے زیادہ آپ کو ادا کرنا پڑے گا

قیمت کے ردوبدل کے زمانے میں اس طبقے کے مفاد سے حکومت کی پالیسی بہت بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے۔

دوسرا طبقہ کاروباری لوگوں کا ہے۔ ان کے مفاد میں اور سرمایہ کاروں کے مفاد میں جہاں بہت سی یکسانیت ہوتی ہے وہیں زر کی قیمت میں ردوبدل کی صورت میں نمایاں تضاد بھی ہیں، سب سے پہلا تضاد تو اس لین دین کے سلسلے میں دکھائی دیتا ہے جو ان دونوں طبقوں میں باہمی نفع کیلئے ہوتی ہے۔ کاروباری لوگ سرمایہ کاروں سے متعین رقمیں متعین شرح سود پر لیتے ہیں، اگر ان قرضوں کی ادائیگی کے وقت قیمتوں میں بہت ردوبدل ہو تو اس سے یہ دونوں طبقے مختلف طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ زر کی قیمت میں کمی ہو تو سرمایہ کاروں کا نقصان ہوتا ہے کیونکہ انہیں حقیقی قوت خرید کے لحاظ سے اب کم واپس ملتا ہے، اس کے برخلاف قرض لینے والوں کا فائدہ ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے قرض کی رقموں سے جتنی چیزیں خریدی تھیں اب قرض کی ادائگی کے وقت اُنھیں کم دینا پڑتا ہے۔ قرض کی رقم تو بلا شبہ وہی رہتی ہے، لیکن زر کی اہمیت تو اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے مختلف چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے قرض دینے والے گھاٹا اُٹھاتے ہیں، اُن کی دی ہوئی رقم سے قرض لینے والوں نے زیادہ مقدار میں چیزیں حاصل کی تھیں، اب جب انہیں وہ رقم واپس ملتی ہے تو وہ اس سے کم مقدار میں چیزیں حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب زر کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو سرمایہ لگانے والوں کا بھلا ہوتا ہے اور کاروباری لوگوں کا نقصان۔ یہ فائدہ نقصان تو اس صورت میں ہوا جب قیمتیں گر گئی ہوں، یا بڑھ گئی ہوں قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کے

زمانے میں بھی اسی طرح کے نتائج پیدا ہوتے ہیں، قیمتوں میں تبدیلیوں کے زمانے میں کاروباری لوگ چاہے وہ تاجر ہوں یا مل مالک کچھ نہ کچھ چیزیں بیچنے سے پہلے خریدتے ہیں، خرید کے زمانے میں اگر قیمت بڑھ رہی تھی تو قیاس یہ ہے کہ بیچنے کے وقت تک قیمتیں اور بھی بڑھ جانے کے وجہ سے انھیں زیادہ نفع ہوگا۔ اگر اس وقت قیمتیں گر رہی تھیں تو نتیجہ اُلٹا ہوگا۔ قیمتوں کے اضافہ کے زمانے میں تاجر اور دوسرے کاروباری لوگ جی بھر کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسکی بڑی عمدہ مثال ہمیں لڑائی اور اسکے بعد کے افراط زر کے ان حالات میں ملتی ہے جو خود ہمارے ملک میں دیکھنے میں آچکی ہیں۔ بنگال کے قحط کے زمانے میں غلّے کے تاجروں نے اس اُمید میں ذخیرہ اندوزی کی کہ مزید قیمتیں بڑھ جانے کے بعد اسے بیچ کر خوب نفع کمائیں گے، چنانچہ اس ذخیرہ اندوزی کی بدولت غلّے کے دام اور بھی بڑھے اور انھوں نے خوب جی بھر کر نفع کمایا۔ بنگال کے قحط کے سلسلے میں حکومت نے جو کمیشن مقرر کیا تھا اُس نے لکھا ہے کہ بنگال کے قحط کا سبب کچھ تو اناج کی کمی تھی، کچھ قیمتوں کا یہ اضافہ۔ اسی طرح مختلف صنعتوں نے اس صورتِ حال سے من مانا نفع کمایا۔ چنانچہ ایک سرکاری اندازے کے مطابق سَو روپے کے سرمائے پر مختلف صنعتوں نے ۵۰۰ سے ایک ہزار تک کمائے ہیں۔

ہمارا تیسرا طبقہ تنخواہ پانے والوں کا ہے۔ معاشیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ قیمتوں میں اضافے کے وقت اجرتیں، یا تنخواہیں اتنی تیزی سے نہیں بڑھتیں، چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدوروں اور دوسرے تنخواہ پانے والوں کی حقیقی

عام طور پر تو اس بات کی صحت سے انکار نہیں کیا جاتا لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں مزدوروں کی انجمنیں، یا مزدور تحریک اب اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ اب مزدوروں کی اجرتوں میں بھرپور اضافہ ہو جاتا ہے اور قیمتوں کے اضافے سے انھیں نقصان نہیں ہوتا۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ مل مالک اور کاروباری لوگ مزدوروں کو وہی اجرت دیتے ہیں جس پر وہ مجبور ہو جائیں، بعض اہم صنعتوں میں، اور مزدوروں کی خاص خاص جماعتوں کو جو صنعت کے لئے خاص طور پر بہت اہم ہوتے ہیں اور جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا انہیں تو قیمتوں میں اضافے کی صورت میں ضرور اجرت میں اضافے ملتے ہیں۔ لیکن عام مزدوروں کو اتنی مہنگائی، یا بڑھی ہوئی اجرتیں نہیں ملتیں کہ قیمتوں میں اضافہ کی تلافی ہو جائے، چنانچہ ایسٹرن اکونومسٹ نے تسلیم کیا ہے کہ لڑائی اور لڑائی کے بعد کی مہنگائی میں ہمارے مزدوروں کی حقیقی اجرتوں میں لگ بھگ بیس فیصدی کی کمی ہوئی ہے کیونکہ ان کی اجرتوں میں کافی اضافے نہیں ہو پائے ہیں۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قیمت میں ردوبدل کے زمانے میں ایک نہ ایک وقت دوسرے دونوں طبقوں کا بھلا ہوتا ہے لیکن جہاں تک ہمارے اس تیسرے طبقے کا تعلق ہے وہ زر کی دونوں ہی تبدیلیوں کے زمانے میں گھاٹے میں رہتا ہے۔ جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو اس کی آمدنی کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے، لیکن جب قیمتیں گھٹتی ہیں تو اسے روزگار کے لالے پڑ جاتے ہیں کیونکہ قیمتوں کے گرنے کی صورت میں مل مالک اور کاروباری لوگ اپنا کام سمیٹنے لگتے ہیں اور اس کی بدولت مزدوروں کی چھٹنی شروع ہو جاتی ہے، اور بے روزگاری کے زمانے میں ظاہر ہے قیمتوں کی کمی یا زر کی قیمت

میں اضافے سے اُن کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا جن کی آمدنی کے ذرائع ہی ختم ہو چکے ہوں۔
اوپر کی گفتگو سے یہ بات صاف ہو گئی ہو گی کہ زر کی قیمت میں ردوبدل سے سماج میں تقسیم دولت پر نمایاں اثر پڑتا ہے اور یہ دولت کی تقسیم ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ معاشی حیثیت سے سب سے زیادہ کمزور اور گنتی میں سب سے بڑا طبقہ مصیبتوں کا شکار ہو جاتا ہے لیکن زر کی قیمت میں تبدیلیوں کے خلاف یہی ایک بات نہیں کہی جا سکتی۔ اوپر ہم نے کہا ہے کہ قیمتوں کے گرنے کی وجہ سے روزگار میں کمی آجاتی ہے۔ یہ بات دراصل ذرا مختلف طریقے پر کہنا چاہیے کیونکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ زر کی قیمت میں ردوبدل روزگار کی کمی بیشی کا سبب ہوتا ہے۔ اصل تو یوں ہے کہ روزگار اور زر کی قیمت دونوں ہی کسی اور چیز سے متاثر ہوتی ہیں یہ کیا ہے؟ یہ اگلے صفحات سے واضح ہو جائے گا۔ فی الحال تو اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ان میں سبب اور نتیجے کا رشتہ ایک حد تک ہی صحیح ہے قیمتیں کیوں گرنے لگتی ہیں۔ روزگار میں کیوں کمی آتی ہے، ہم اس منزل پر ان سوالات کے جوابات نہیں دے سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب قیمتیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں، یا اُن میں اضافہ ہونے لگتا ہے تو اس سے روزگار پر نمایاں اثر پڑتا ہے مثلاً جب قیمتیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں تو تاجر چیزیں خریدنا بند کر دیتے ہیں، جب چیزوں کی خرید میں کمی آتی ہے تو قدرتاً ان کی پیداوار میں بھی کمی ہوتی ہے کیونکہ مل مالک جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ چیزیں تیار کرتے ہیں ان کیلئے بازار میں انھیں جو قیمتیں ملتی ہیں اُن میں نفع کم ہے تو وہ اپنا کاروبار سمیٹنے لگتے ہیں لیکن جیسے ہی قیمتیں گرنی بند ہو جاتی ہیں اور اضافے کے رجحانات دکھائی دینے لگتے ہیں تاجر لوگ اپنی اپنی دکانیں مال سے بھرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں

یہ امید ہو جاتی ہے کہ جو چیزیں وہ آج ایک روپے میں خریدیں گے وہ کل ان کا یہ زیادہ میں بکیں گی۔ زیادہ مال خریدنے کا مالکوں پر لازمی طور پر اثر پڑتا ہے کیونکہ اب ان کی بنائی ہوئی چیزوں کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے اور نفع بھی ساتھ ساتھ بڑھتا دکھائی دیتا ہے اس لئے وہ پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ اپنے کاروبار کو پھیلاتے ہیں تو ان صنعتوں کا بھی بہت بھلا ہوتا ہے جو مشینیں بناتی ہیں کیونکہ اب مشینوں کے بدلنے اور نئی مشینوں کی مانگ کی وجہ سے ان کی پیداوار کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے، اس طرح پیداوار میں ہر طرف اضافہ ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قیمتوں میں اضافے کے زمانے کو خوش حالی کا دور سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں ہر شخص کو بڑی آسانی سے کام مل جاتا ہے اور اس لئے سبھی اس دکھاوے کی خوش حالی سے تھوڑا بہت مطمئن ہو جاتے ہیں قیمتوں میں کمی کے زمانے کو کساد بازاری کا دور اسی لئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں روزگار کے لالے پڑ جاتے ہیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ قیمتوں کے اضافے کے زمانے میں پیداوار میں اضافہ ناگزیر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن ہمارے ملک کی مثال موجود ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ایسا ہونا ضروری نہیں، ہمارے ہاں ۱۹۴۴ء پیداوار کے لحاظ سے سب سے بہتر سال تھا۔ اس برس تقریباً سبھی چیزوں کی پیداوار میں اضافے اپنی معراج کو پہونچ گئے، اس کے بعد سبھی قیمتوں میں اضافے ہوئے ہیں لیکن اس کے ساتھ پیداوار میں اضافے نہیں ہوئے ہیں، یا اگر کہیں بڑی الله آمین کے بعد کوئی اضافہ ہوا بھی ہے تو بہت معمولی مختلف صنعتوں کی صلاحیت

پیداوار کا بھی پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے، چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فولاد، کپڑے اور بعض دوسری اہم صنعتوں کی پیداوار میں اضافے کی صورتیں نکالنے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی بنادی جائے۔

ایک دل چسپ سوال یہ ہے کہ قیمتوں میں اضافے سے ہمارے ملک کے مختلف طبقوں پر کیا اثر پڑا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے زراعت پیشہ طبقے کو قیمتوں میں اضافے سے بہت فائدہ پہونچا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ اناج کے دام میں بہت اضافہ ہوا ہے اس لئے اس طبقہ کی خوش حالی میں ضرور اضافہ ہوا ہوگا۔ اس سلسلے میں چند باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثریت ایسے کسانوں کی ہے جن کے پاس بہت چھوٹے چھوٹے کھیت ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی پیداوار بہ مشکل ایسی ہوتی ہے کہ اس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کرلیں۔ چنانچہ اس بڑے طبقے کیلئے پیداوار کو بیچ کر فائدہ اُٹھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ انہیں ضرورت کی چیزوں کی مہنگائی سے یقیناً نقصان پہونچا۔ اب وہ لوگ ہیں جن کے پاس تھوڑا بہت فاضل اناج ہوتا ہے، انھیں کتنا فائدہ ہوا اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ان مختلف چیزوں کے خریدنے کے لئے جو دام دینے ہوتے ہیں اُن میں کتنا اضافہ ہوا۔ اگر یہ اضافہ کم ہوا ہے اور قیمتوں میں اضافہ زیادہ ہوا ہے تو انہیں کچھ فائدہ ضرور پہونچا ہوگا۔ لیکن ہمارے ملک میں زراعتی مصارف پیداوار کے متعلق کوئی اعداد و شمار نہیں ملتے اس لئے اس کے

متعلق کچھ بتانا مشکل ہے۔ یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ لڑائی کے پہلے کے تجربے کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ اناج کے بیچنے سے بہت بڑا فائدہ اُن لوگوں کو پہونچتا ہے جن کا کام اناج گاؤں سے شہر تک لانے کی مختلف منزلیں طے کرتا ہے۔ بڑے بڑے زمین داروں کو بھی ضرور فائدہ پہونچا ہے۔ اسی طرح شہروں میں تاجروں نے خوب دولت کمائی ہے۔ مل مالکوں کے بے پناہ منافع کا تھوڑا بہت ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہیں اونچے منافع کی بھی عادت پڑ گئی ہے اور پیداوار میں اب اضافے نہ ہونے کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ اونچے منافع کے امکانات اب کمزور پڑ گئے ہیں، اور مستقبل کے متعلق اور بھی اندیشے ہیں کیونکہ قیمتیں کبھی نہ کبھی گریں گی، اور آج اگر نئی مشینیں خرید کر کوئی کاروبار شروع کیا جائے تو آگے چل کر اسے اس لئے دقت کا سامنا کرنا ہوگا کہ اس کی بنی ہوئی چیزوں کے دام زیادہ ہوں گے، اور قیمتیں کم ہونے کے بعد جو لوگ بھی مشینیں خرید کر لگائیں گے اُن سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

زر درحقیقت ایک پیمانہ ہے جیسے ہم فاصلے کو ناپنے کیلئے انچ یا فٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہ پیمانے بدلنے لگیں تو فاصلہ ناپنے کا کام کتنا مشکل ہو جائے گا؟ زر کی قیمت میں تبدیلی اس لئے بہت دور رس نتائج کا باعث ہوتی ہے۔ اس رد و بدل سے سماج میں دولت کی تقسیم پر نمایاں اثر پڑتا ہے، اور اس نئی تقسیم سے معاشی ہی نہیں سیاسی اور سماجی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں اور جرمنی میں افراط زر کی بدولت اوسط طبقے کی ایک بڑی تعداد کی مالی حیثیت کو سخت دھچکا لگا۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں پس انداز

کر کے جو لوگ کچھ تھوڑا بہت کما لیتے تھے اُن کی حیثیت ختم ہو گئی۔ چنانچہ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ ہٹلر کے عروج کا سبب یہ تھا کہ اس نے اوسط طبقے کو جو تباہ ہو گیا تھا سبز باغ دکھائے اور وہ اس کے قابو میں آ گیا۔

چوتھا باب

زر کی عام قیمت کا تعین کیونکر ہوتا ہے

پچھلے باب میں ہم نے زر کی قیمت کے تصور اور اس قیمت میں ردوبدل کے نتائج سے بحث کی ہے۔ اب ہمیں اس بنیادی سوال سے بحث کرنا ہے کہ زر کی قیمت کا تعین کیونکر ہوتا ہے؟ مختلف چیزوں کی قیمت کا تعین ان کی طلب اور رسد کے باہمی توازن سے ہوتا ہے۔ اگر کسی چیز کی مانگ رسد سے زیادہ ہو تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگر رسد زیادہ ہو تو قیمت کم ہو جاتی ہے۔ جس قیمت پر رسد اور طلب میں باہم توازن پیدا ہو جائے وہی دام بازار میں رائج ہو جاتا ہے۔ نظری معاشیات کا یہ اصول دوسری چیزوں کے دام کے تعین میں جس طرح کام دیتا ہے اسی طرح زر کی قیمت کے تعین میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس نظریہ سے کام لیا جائے زر کی طلب اور رسد کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے، پہلے زر کی رسد کے تصور کی وضاحت کر دینا چاہیئے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ زر کی تین قسمیں ہیں، چھوٹے سکے، حکومت کے جاری کردہ دوسرے سکے یا نوٹ اور زر بنیک کسی وقت ان تینوں کی مجموعی مقدار اس وقت زر کی رسید کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ملک میں زر کی کل مقدار یہ ہے

لیکن زر کی رسد کا تصور ابھی مکمل نہیں ہوا۔ پروفیسر رابرٹسن نے اپنے دلچسپ انداز میں اس تصور کی وضاحت یوں کی ہے۔ زر کی رسد کا تصور کسی خاص وقت سے متعلق ہوگا، فرض کیجیے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس ہفتے زر کی رسد کیا تھی۔ اب یہ ممکن ہے کہ زر کی مجموعی مقدار میں سے اس ہفتے کچھ سکے میری جیب میں چھٹی منا رہے ہوں، کچھ اتنے پرانے ہو چکے ہوں کہ صحت کی خاطر بنک کے خزانے میں آرام فرما ہوں، کچھ زیر زمین دفن ہوں۔ کچھ سکے ممکن ہے کی طرح بہت تیز رفتار ہوں اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں بہت تیزی سے گردش کرتے رہیں، کچھ اتنے سست جیسے حرکت کی عادت ہی نہ رہی ہو، یا جیسے کوئی بڑی بی ریلوے کا ٹکٹ خرید رہی ہوں، اس لئے زر کی رسد کے تصور کے واضح کرنے کیلئے ان کی "گردش کی تیزی یا سستی کے تصور کی مدد لینا ضروری ہے

لیجئے ایک کہانی سن لیجیے تاکہ یہ تصور پوری طرح ذہن نشین ہو جائے دو آدمیوں باب اور جو نے کاروبار کی سوچی، طے یہ پایا کہ ڈربی کی ریس کے دن ریس کے میدان میں بیئر بیچی جائے۔ وہ دن آیا اور ان لوگوں نے ایک پیپے بھر شراب حاصل کی، طے یہ پایا کہ میدان میں چھ پینس فی گلاس کے حساب سے بیئر بیچی جائے، اور یہ چھ پینس نفع میں برابر برابر بٹ جائیں گے۔ باب کے پاس تین پینس پڑے تھے، راستہ میں اسے پیاس لگی، چنانچہ اس نے ایک گلاس پی لی اور تین پینس جو کو دیدئے کہ ایک گلاس کی قیمت میں اس کا حصہ بھی تھا۔ تھوڑی دیر میں جو صاحب کو بھی پیاس نے ستایا، اور تین پینس باب کی جیب میں واپس آ گئے، ایک گلاس بیئر اور ختم ہو گیا، گرمی ذرا زیادہ تھی اس لئے پیاس کا دورہ

رہ رہ کر دونوں کو ہی پڑتا رہا، جب دونوں میدان میں پہونچے تو بیر سب ختم ہوگئی تھی، تین پینس باپ کی جیب میں واپس آگئے تھے اور کسی کا کسی پہ کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ تین پینس کی مدد سے پوری شراب صاف ہوگئی تھی، حالانکہ اگر اسے چھ پینس فی گلاس حساب سے بیچا جاتا جیسا کہ ابتدا میں طے ہوا تھا تو اس شراب کی لین دین کے لئے کئی شلنگ خرچ ہوتے ہیں[1] زر کی رسد زر کی مختلف قسموں کی مجموعی مقدار اور ان کی "گردش کے زور" سے متعین ہوتی ہے اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ ایک سال، ایک مہینے یا ایک ہفتے میں کتنی رقم مختلف قسم کے لین دین کے لئے استعمال ہوئی تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ زر کی جتنی مقدار اس مدت میں موجود رہی ہو اُسے اس تعداد سے ضرب دیدیجئے جتنی مرتبہ ایک سکے نے اوسطاً گردش کی ہو۔ فرض کیجئے اس مدت میں زر کی مجموعی رقم سو روپے تھی، اور ہر روپیہ دو مرتبہ لین دین کے لئے دو مرتبہ کام آیا تو اس وقت زر کی مجموعی رقم یا رسد دو سو روپے سمجھنا چاہیے۔

زر کی مانگ کا تصور بھی تھوڑی سی توجہ کا مستحق ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زر کی اہمیت یہی ہے کہ اس کے ذریعہ ہم مختلف چیزیں حاصل کر سکتے ہیں، کوئی روپے کو روپے کی خاطر نہیں رکھتا، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے مختلف چیزیں حاصل کی جائیں۔ اس لئے زر کی مدد سے کوئی سوسائٹی جتنی چیزیں خریدنا چاہتی ہوگی زر کی اتنی ہی مقدار کی اُسے ضرورت ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ زر کی مانگ کا تعین

---

[1] یہ کہانی پروفیسر رابرٹسن نے پروفیسر ایچ۔ ودرتھ کے ایک مضمون سے لی ہے اور اپنی کتاب "زر" میں بیان کیا ہے۔

اس سے ہوگا کہ سوسائٹی کو کیا کیا چیزیں، کتنی کتنی مقدار میں خریدنی یا حاصل کرنی ہیں۔ سوسائٹی میں کسی متعین مدت میں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں، کتنے ٹن گیہوں، کتنا کاغذ، کتنے گز کپڑا، اور وہ لاتعداد چیزیں جو کوئی ملک تیار کرتا ہو کمپنیوں کے حصے، تجارتی دستاویز، مکان اور مشینیں اور اسی طرح کی اور سیکڑوں چیزیں، ان کی مانگ سے یہ طے ہوتا ہے کہ سماج کو زر کی کتنی ضرورت ہے؟ یا اس سماج میں زر کی کتنی رقم کی مانگ ہوگی۔

اب اگر مانگ کے حالات کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی ہے تو زر کی قیمت کا تعین اس کی رسد سے ہوگا۔ اگر زر کی رسد میں کمی آ جائے تو ہر سکے کی قیمت زیادہ ہو جائے گی۔ اگر رسد میں اضافہ ہو جائے تو زر کی قیمت میں کمی ہو جائے گی۔ مختصراً یہ زر کی قیمت کا وہ نظریہ ہے جسے اصطلاحاً "نظریہ مقدار" کہتے ہیں کیونکہ اس کے ماننے والوں کے نزدیک زر کی قیمت کا تعین زر کی مقدار سے ہوتا ہے۔ زر کی قیمت کے متعلق یہ نظریہ شاید سب سے پرانا ہے اور تنقیدوں کے باوجود شاید سب سے زیادہ مقبول بھی رہا ہے۔ اس کے آغاز کی کہانی بہت ہی پرانی ہے، رومن تحریروں میں اس کا ذکر ملتا ہے، لیکن سولھویں صدی میں قیمتوں کی انقلابی تبدیلیوں کے زمانے میں اسے زیادہ ترقی ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک ہیوم اور دوسرے مصنفوں کی کوششوں نے اس کی موجودہ شکل دی۔ آج کل اس کی دو شکلیں رائج ہیں، اور آئندہ صفحات میں ہم ان دونوں سے بحث کریں گے۔ فی الحال تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ "نظریہ مقدار" کا خاص خیال کیا

پروفیسر جینیڈ لر نے بتایا ہے اس نظریئے کے لئے موزوں نہیں جس سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ یہ اُس نظریئے کے لئے تو ضرور مناسب تھا جس کے لئے وہ ایجاد ہوا تھا، پُرانے نظریوں اور موجودہ نظریوں میں اب وہی فرق ہے جو قرونِ وسطےٰ اور آج کے مکانوں میں ہوتا ہے۔ نظریۂ مقدار کے حامی اب یہ مانتے ہیں کہ زر کی قیمت کے تعین کا دار و مدار تین قسم کے اثرات پر ہوتا ہے، (۱) زر کی مقدار (۲) اسکی گردش کا زور اور تیسرے یہ بات کہ زر کی مدد سے کتنی لین دین کرنی ہوتی ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ "عام قیمتوں پر زر کی مقدار اور اس کی گردش کے زور کی تبدیلیوں کا ایک اثر پڑتا ہے۔ اگر ان دونوں میں اضافہ ہو تو قیمتیں بھی بڑھتی ہیں، اگر ان میں کمی ہو تو قیمتیں کم ہوتی ہیں، زر کی مدد سے چیزوں وغیرہ کی خرید کی مقدار میں رد و بدل کا عام قیمتوں پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ یعنی اگر چیزوں کی مقدار زیادہ ہو تو عام قیمتیں گرتی ہیں اور اگر کم ہوں تو عام قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے" اور قیمتوں میں اضافے ان تینوں اسباب، یا ان میں سے کسی ایک کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں نظریۂ مقدار کے ماننے والے یہ نہیں کہتے کہ قیمتوں میں تبدیلی محض زر کی مقدار میں، رد و بدل کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد آیئے اب "نظریۂ مقدار" پر ذرا تفصیل سے بحث کریں۔ اس نظریئے کے ماننے والوں نے اپنے نظریئے کو ایک ایکویشن (EQUATION) کی شکل دی ہے۔ فرض کیجیے زر کی کل مقدار

"ز" ہے اور اسکی گردش کے زور کو ظاہر کرنے کیلئے ہم لفظ "گ" استعمال کرتے ہیں تو زر کی کل رسد = زگ ۔ اس سے ہم جو کام لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مختلف قیمتوں پر سماج کی کل تجارتی پیداوار کو خریدلیں، اس تجارتی مقدار کو اگر ہم لفظ "ت" سے ظاہر کریں اور قیمتوں کے لئے "ق" کا نشان اختیار کریں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے

ق ت = زگ   اس لئے ق = زگ/ت

اس ایکویشن میں ایک بہت کھلی ہوئی بات پیش کی گئی ہے اس لئے آپ کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ یہ بے معنی سا ایکویشن ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہمیں یہ بتانا ہے کہ زر کی قیمت کے تعین میں تین قسم کے اثرات کام کرتے ہیں۔ اب ز، گ اور ت جنھیں ہم نے ان اثرات کا مظہر مان لیا ہے۔ خود بہت سے اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور خود ان پر بہت سے اثرات کام کرتے ہیں۔ اور زر کی قیمت کے تعین پر جو اثرات کام کرتے ہیں ان کی تلاش اس ایکویشن میں نہیں بلکہ ان کے باہر کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کوئی یہ کوشش کرے کہ ان مختلف اور ان گنت اثرات کو جو زر کی قیمت پر کام کرتے ہیں، چند موٹی موٹی سرخیوں میں تقسیم کئے بغیر آپ کو سمجھا دے، یا کوئی نتیجہ خود نکال لے تو یہ کوشش رائگاں جائے گی۔ یہ ایکویشن زر سے بحث کرنے والوں کے لئے ایک منطقی ڈھانچہ فراہم کردیتا ہے کہ وہ اس سے نتیجے نکال لینے میں اور اپنی بات دوسروں کو سمجھانے میں مدد لیں۔

پھر اس ایکویشن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ زر کی مقدار میں کمی یا زیادتی کا زر کی قیمت پر اسی تناسب سے —— یا کوئی بھی —— اثر پڑیگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ زر کی مقدار میں کمی یا زیادتی کا پیداوار پر، یا گردش کے زور پر الٹا اثر پڑے اور زر کی مقدار میں اضافے یا کمی کے اثر کی تلافی ہو جائے۔ مثلاً فرض کیجئے زر کی گردش کا زور ۲ ہے، اب زر کی مقدار میں دگنے کا اضافہ ہو جاتا ہے، اب اگر فرض کیجئے گردش کا زور گھٹ جائے اور آدھا رہجائے تو زر کی مقدار میں اضافے کا مجموعی رسید پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ یا فرض کیجئے زر میں اضافے کے ساتھ ساتھ چیزوں کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ زر کی بڑھی ہوئی مقدار زر کی بڑھی ہوئی مانگ کے برابر ہی رہتی ہے تو بھی اس اضافے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ ایکویشن یہ بھی نہیں کہتا کہ اس میں سبب کیا ہے اور نتیجہ کیا ہے اور نہ یہ کہ سبب اور نتیجے کا یہ باہمی رشتہ کیوں کر کام کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ زر کی مقدار میں ردوبدل ہی قیمتوں میں کمی بیشی کا سبب ہوتا ہے، اور نہ یہ کہ یہ کمی بیشی کیونکر واقع ہوتی ہے۔

پھر اس ایکویشن سے آخر کیا کام لیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے آیئے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ زر کی مقدار میں کمی بیشی کا لمبی مدتوں میں کیا اثر پڑتا ہے۔ نظریۂ مقدار کے بیشتر ماننے والوں کا کہنا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافے یا کمی کا لمبی مدتوں میں اثر یہ ہوتا ہے کہ قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ یا کمی ہو جائے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ زر کی مقدار میں کمی یا بیشی کا

یہ نتیجہ ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ گردش کے زور یا تجارت کی مقدار میں تبدیلی اس کمی بیشی کی تلافی کر دے لیکن اس کے باوجود وہ یہ مانتے ہیں کہ زر کی مقدار میں کمی بیشی کا اثر یہی ہوتا ہے کہ قیمتوں میں بھی کمی یا اضافہ ہو۔ اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم لمبی مدت، جیسے بیس برس، کی قیمتوں کی تبدیلیوں سے بحث کر رہے ہوں تو تجارت کی مقدار اور زر کی گردش کے زور کا تعین زر کی مقدار کے بجائے دوسرے بنیادی اثرات کی بدولت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گردش کے زور کا تعلق ان باتوں سے ہے کہ لوگ حساب کتاب کتنی مدت کے بعد کرتے ہیں، بینکنگ اور دوسرے اس طرح کے اداروں کی ترقی کس حد کو پہونچی ہے۔ دوسرے الفاظ میں زر کے استعمال کے سلسلے میں لوگوں کی کیا عادتیں بن گئی ہیں (ان تمام اسباب کی وضاحت کے لئے فٹ نوٹ دیکھیے) اسی طرح تجارت کی مقدار کا تعین ایسے بنیادی اثرات سے ہوتا ہے جن کا زر کی مقدار سے بہت معمولی سا تعلق ہے۔ خوش حالی اور کساد بازاری کے دنوں میں تجارت کی مقدار میں بہت زیادہ ردو بدل ہوتا ہے لیکن اگر

اس تصور کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ فرض کیجئے ہمارے ملک میں صرف ایک من گیہوں پیدا ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں، تو ہمارے ہاں زر کی ضرورت صرف اس لئے ہوگی کہ اس کی مدد سے ایک من گیہوں خریدا جا سکے فرض کیجئے زر کی کل رقم دس ہے، اور گردش کا زور دو، یعنی زر کی کل رسد بیس روپے ہے، ایک من گیہوں کا دام بیس روپے ہوگا۔ اب اوپر کے (EQUATION) کی مدد سے دیکھئے۔ اس مثال میں ق = ۲۰ تجارت ایک من گیہوں کی ہوگی اس لئے ت = ۱۔ اس لئے ق ت = ۲۰، ادھر ز = ۱۰۔ اور گ = ۲۔ اس لئے زگ = ۲۰۔ اس لئے ق ت = زگ۔ دراصل یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں۔ ایک کا دوسرے کے برابر ہونا ناگزیر ہے، آپ جتنے روپے خرچ کریں، وہ لازماً ان چیزوں کے برابر ہوں گے۔ جو آپ خریدیں، یا جو کوئی آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔

ان تبدیلیوں کو ایک بڑی مدت پر پھیلا دیا جائے تو تبدیلی کی رفتار بہت ہی معمولی ہوتی ہے۔ اب اگر یہ کہا جا سکے کہ بیس برس کے زمانے میں گردش کے زور اور تجارت کی مقدار میں چاہے ویسے کتنی ہی تبدیلیاں ہوں لیکن اتنی بڑی مدت پر پھیلا کر دیکھا جائے تو ان کا اوسط بہت کم ہوگا تو اگر ہم یہ دیکھیں کس وقت قیمتیں بیس برس پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ یا بہت کم ہیں تو ظاہر ہے، ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ تبدیلی زر کی مقدار میں ردوبدل کا نتیجہ ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت زیادہ وقت لینے والی تبدیلیوں میں زر کی مقدار قیمت پر اثر ڈالنے کا سب سے نمایاں سبب ہوتی ہے۔

تاریخ کی شہادت اس نتیجے کی حمایت میں ہے۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۹۱۴ء تک برطانیہ میں قیمتوں میں تبدیلی کے چار اہم دور گزرے ہیں، یہ زمانہ وہ ہے جب زر کی مقدار کا تعین سونے کی مقدار سے براہِ راست یا بالواسطہ ہوتا تھا۔ جہاں تک سکوں کا تعلق تھا وہ تو سونے کے تھے ہی، بینک بھی سونے کی مقدار کے ہی پابند تھے، یہ چاروں دور بڑی آسانی سے سونے کی رسد میں کمی بیشی کے لحاظ سے الگ کئے جا سکتے ہیں۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۹ء تک انگلستان میں کاروبار میں برابر اضافہ ہوتا رہا لیکن اس دور میں سونے کی مقدار میں اضافہ نہیں ہوا۔ دوسرے الفاظ میں سونے کی مقدار میں جس پر زر کی مقدار کا دارومدار تھا اتنی تیزی سے اضافہ نہیں ہوا جتنی تیزی سے تجارت کی مقدار میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس دور میں قیمتوں میں کمی ہو رہی تھی، ظاہر ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیمتوں میں کمی کی وجہ سے سونے کی قلت محسوس ہوئی، سونے کی کمی کی وجہ سے قیمتوں میں کمی ہوئی ہوگی۔ اس نتیجے کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں قیمتوں کے اس رجحان میں تبدیلی ہوئی اور اسی سال کیلی فورنیا اور آسٹریلیا میں سونے کی نئی کانیں دریافت ہوئیں۔ اگلے ۲۵ برس سونے کی

مقدار بڑھتی رہی، تجارت کی مقدار اتنی نہیں بڑھی اور قیمتوں میں اضافے ہوئے۔ سنہ ۱۸۷۳ء کے بعد سونے کی سالانہ پیداوار میں پھر کمی ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی ملکوں نے سونے کو زر کی حیثیت استعمال کرنا شروع کیا۔ اس لئے زر کی مانگ بھی بڑھ گئی اس لئے برطانیہ کے لئے سونے کی رسد میں کمی آگئی، اور قیمتیں پھر گرنے لگیں۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں جنوبی افریقہ میں سونے کی کانیں دریافت ہوئیں، سونے کی پیدا میں بہت سا اضافہ ہوا اور برطانیہ کو زیادہ سونا ملنے لگا نتیجۃً قیمتیں پھر بڑھنے لگیں جیسا کہ کراؤتھر نے کہا ہے سونے کی مقدار میں کمی اور بیشی اور قیمتوں میں کمی اور زیادتی کے درمیان یہ تعلق اتنا گہرا ہے کہ اسے محض اتفاق کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا اس سلسلے میں بغیر کسی پس وپیش کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں زر کی مقدار میں تبدیلیوں نے قیمتوں پر یہ اثرات ڈالے۔

چھوٹی سی مدت سے بحث ہو تو زر کی مقدار میں کمی بیشی کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ زر کی مقدار میں بینک کس طرح اضافہ یا کمی کر سکتے ہیں۔ خوش حالی کا زمانہ ہو تب تو مرکزی بینک کے لئے اتنا کافی ہوگا کہ وہ قرض کی لین دین کو آسان کرنے کے لئے شرح سود کم کر دے یا بازار میں دستاویزیں بیچنا شروع کر دے اور بینک خود بہت سی رقم قرض دینے کا انتظام شروع کر دیں گے۔ لیکن جب کساد بازاری کا آغاز ہو چکا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں کہ اگر بینکوں کے محفوظ سرمائے میں اضافہ ہو تو وہ زیادہ اعتبار کریں کیونکہ ایسے زمانے میں بینکر یہ خطرہ مول لینے کے لئے کم تیار ہوتے ہیں کہ قرض دیں اور کاروباری لوگ قرض لینے کیلئے بھی ایسے مشتاق نہیں ہوتے ایسے وقت میں بھی اگر مرکزی بینک چاہے اور اعتبار کی سہولتیں فراہم کرے تو کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا ہے

غرض کبھی

پہلے کے مقابلہ میں زیادہ زر کی مقدار آجاتی ہے۔ چونکہ یہ آسانی سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے طور پر یہ طے کر چکے ہوں گے کہ ان کے اخراجات کیا ہوں گے، اب جن لوگوں کے پاس یہ نیا زر پہونچے گا وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کے پاس اب جتنا روپیہ جمع ہو گیا ہے وہ اس سے زیادہ ہے جتنے کی انھیں ضرورت تھی اور وہ اس نقد کو کسی نہ کسی طرح خرچ کرنا چاہیں گے ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک اخراجات میں زر کی مقدار کے لحاظ سے کم اضافہ ہو کیوں کہ جہاں تک عام اخراجات کا تعلق ہے اُن کی حد عادت پر مبنی ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی دھیرے دھیرے ہوتی ہے جہاں تک سرمایہ لگانے کا تعلق ہے اس میں دیر ہو سکتی ہے لیکن اخراجات میں اضافے کے لئے ایک دباؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ اب اگر زر کی مقدار میں اضافہ نمایاں ہو اور لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ قیمتیں بڑھیں گی تو گردش کے زور میں بھی اضافہ ہو گا، کیونکہ لوگ یہ سوچیں گے کہ قبل اس کے کہ قیمتوں میں زیادہ اضافہ ہو جائے مختلف چیزیں خرید لیں اس لئے اگر تجارت میں اضافہ شروع ہو چکا ہو تو کچھ عرصہ تک یہ ہو گا کہ لوگوں کے اخراجات میں زر کی مقدار میں اضافے سے زیادہ تیز اضافہ ہو گا، اور اگر ایسا ہو تو قیمتوں میں اضافہ ہو گا، اس کے برخلاف اگر زر کی مقدار میں کمی کی جائے تو اس کے اُلٹے نتیجے نکلنے چاہئیں۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر زر کی مقدار میں اضافہ کیا جائے تو کساد بازاری کا علاج ہو سکتا ہے۔

بدقسمتی سے تاریخ سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جب کساد بازاری کا علاج کرنے کے لئے زر کی مقدار میں اضافے کے نسخے سے کام لیا گیا ہے لیکن وہ کارگر ثابت نہیں ہوا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں امریکہ کے بینکوں کا سرمایہ محفوظ ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں دگنا تھا، لیکن اس زر کی کوئی مانگ نہیں تھی اس لئے یہ بیکار رہا اور قیمتیں اور روزگار کی مقدار دونوں ہی ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں بہت کم اور اس کی وجہ یہ تھی کہ زر میں اضافے کا گردش کے زور پر وہ اثر نہیں پڑا جو ہم نے اوپر کی

گفتگو میں نظری طور پر صحیح مان لیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک تھوڑی مدت کی تبدیلیوں کا تعلق ہے زر کی مقدار کی تبدیلی فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے اثرات ان تبدیلیوں کی تلافی کریں، یا انہیں بیکار کر دیں یہی وجہ ہے کہ جہاں تک خوش حالی اور کساد بازاری کے چکر کے دوران میں قیمتوں میں رد و بدل کا تعلق ہے "نظریہ مقدار" بہت مفید نہیں لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ تھوڑی سی مدت میں ہو جانے والی کسی بھی تبدیلی کو اس نظریے کی مدد سے سمجھا اور سمجھایا نہیں جا سکتا۔ پہلی لڑائی کے بعد مختلف ملکوں میں افراط زر کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ تمام تر زر کی مقدار میں اضافے کی بدولت تھی اس وقت ہمارے ملک میں عام مہنگائی کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں زر کی مقدار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے ۴۵-۱۹۴۴ء تک مختلف چیزوں کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہا تھا، اس کے باوجود قیمتوں میں اضافے کا ذمہ دار زر کی مقدار کے علاوہ اور کسی چیز کو بھی نہیں ٹھیرایا جا سکتا اب پیداوار گھٹ گئی یا گھٹ رہی ہے، زر کی مقدار میں اضافے کی رفتار میں کمی ہو گئی ہے کہیں پیداوار کے کم ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ قیمتوں میں اضافے کو ایک اور سہارا مل گیا ہے۔

اوپر کی گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چھوٹے عرصہ کی تبدیلیوں میں عموماً زر کی اہمیت فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ اس لئے ہمیں نظریہ مقدار کے علاوہ کوئی اور چیز ڈھونڈنی ہوگی جو ان تبدیلیوں کی تشریح کر سکے لیکن اوپر ہم نے یہ کہا ہے کہ زر کی مقدار میں کمی بیشی کی تلافی گردش کے زور سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس تصور کو اس لئے بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور نظریہ مقدار کے حامیوں کے ایک گروہ نے اسی تصور کے گرد نظریہ مقدار کا ایک اور ایکویشن نکالا ہے۔ اس سے ہم اگلے صفحات میں بحث کریں گے۔

(۴) ایک اور نظریہ

اس دوسرے اسکول کی رائے میں بھی زر کی قیمت کا تعین اس کی طلب اور رسد کے باہمی تعلق سے ہوتا ہے لیکن یہاں طلب کا تصور پہلی صورت سے مختلف ہے۔ پہلی صورت میں زر کی مانگ زر کی مانگ نہیں تھی، بلکہ ان چیزوں کی مانگ تھی جن کی آپ کو یا مجھے ضرورت ہو، یا جو ہم خریدنا چاہیں، اس دوسرے اسکول کی رائے میں زر کی مانگ خود زر کی مانگ ہوتی ہے۔ لوگ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ کچھ روپے اپنے پاس اپنے ہاتھ میں رکھیں، اس سے کوئی کام لینا یا نہ لینا موضوع گفتگو سے خارج ہے۔ ہم بارہا یہ بات کہہ چکے ہیں کہ زر کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں، وہ اہم صرف اس لئے ہے کہ اس کی مدد سے چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ نقد کی ملکیت اپنے مالک کے لئے ایک طرح کی قربانی کا باعث ہے۔ آپ کی جیب میں اگر سو روپے پڑے ہوئے ہیں تو انھیں بے کار اس لئے سمجھنا چاہئے کہ خود ان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بدلے میں آپ کے پاس اتنے کی کوئی قیمتی یا اچھی چیز بھی ہوسکتی تھی۔ روپے جمع کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ چیزیں خریدنے سے باز آئیں، اور اگر آپ اس نقد کو جمع کئے رہیں تو آپ پر یہ قربانی بھی لازم آتی ہے کہ کچھ چیزوں کے خریدنے سے باز آئیں۔ دوسری طرف اگر آپ کے پاس روپے نہ ہوں تو اس سے بہت سی دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں، کوئی بہت ہی سستی چیز، کوئی بہت ہی نفع بخش کاروبار

آپ کے ہاتھ سے نکل جائے کیونکہ وقت پر آپ کے پاس پیسے نہیں تھے۔ یا آپ کو ایسی جگہ سے چیزیں خریدنا پڑیں جہاں اُدھار کی وجہ سے دکاندار آپ کو مہنگی یا خراب چیزیں دے اور آپ مجبوراً لے لیں۔ اس سے بھی زیادہ بُرا وقت آسکتا ہے، کسی بُرے وقت پر آپ کو متوقع آمدنی نہ ہو اور آپ معمولی ضروریات زندگی کے لئے ترسیں۔ زر کی صورت میں قوت خرید کا ذخیرہ جمع کئے رکھنے سے فائدے بھی ہوتے ہیں۔ لوگ کرتے یہ ہیں کہ اس فائدے اور اس نقصان کو جو روپے رکھ چھوڑنے کی وجہ سے ہوتا ہے ایک دوسرے سے تولتے ہیں، جدھر کا پلڑا بھاری ہوتا ہے اس صورت کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر روپے کے جمع رکھنے میں زیادہ سہولت زیادہ فائدہ ہوا تو اس رقم میں اضافہ ہو جائے گا جو آپ کسی چیز کو خریدنے، یا کوئی کاروبار کرنے میں نہیں لگائیں گے، ورنہ اس رقم کی مقدار میں کمی کر دی جائے گی۔ یہ تبدیلیاں اُس وقت ختم ہو جائیں گی جب نقد ہاتھ میں رکھنے کے فوائد اور اسے خرچ کرنے یا کاروبار میں لگانے کے فوائد کم و بیش برابر ہو جائیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ اس طرح لوگ جو چیز اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں وہ روپے کی کوئی متعین مقدار یا تعداد نہیں بلکہ ایک خاص مقدار کی قوت خرید ہے۔ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ اتنی قوت خرید اس طرح اپنے پاس رکھ لے جتنی کہ اسے ایک ہفتہ، ایک مہینے، یا ایک سال کے دوران میں مختلف چیزوں کے خریدنے کیلئے اسے ضرورت ہوگی۔

افراد کے ان فیصلوں کی بنیاد پر کہ کتنی رقم یا قوت خرید ہاتھ میں رکھی جائے۔

یہ طے ہوتا ہے کہ پوری سوسائٹی ہاتھ میں رکھنے کیلیے کتنی رقم چاہتی ہے۔ گراوتھ نے انگلستان کے متعلق اندازہ لگایا ہے کہ سالانہ آمدنی کا کوئی نصف لوگ زر کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں۔

اگر سوسائٹی نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ زر کی شکل میں حقیقی سالانہ آمدنی کا نصف حصہ رکھا جائے تو زر کی قیمت اس نصف کے برابر ہوگی اور ہر سکے کی قیمت اسی تناسب سے

۱؎ پروفیسر مارشل نے بہت ہی موزوں الفاظ میں ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر سماج میں لوگ اپنی آمدنی کا ایک حصہ کرنسی کی شکل میں رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ چاہے آمدنی کا پانچواں حصہ ہو، یا دسواں، یا بیسواں۔ کرنسی کی شکل میں بہت سے ذرائع پر قابو سے کاروبار میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اس طرح نقد بچا کر رکھنے سے روپے جن کو (مثلاً) مزید فرنیچر کی خریداری میں لگایا جاتا تو اس سے آرام ملتا، اور اگر کبھی کاروبار میں لگایا جاتا تو مزید آمدنی ہوتی، بیکار شکل میں پڑے رہتے ہیں۔" ہر شخص اس بات کا فیصلہ کہ آمدنی کا کتنا حصہ اس شکل میں رکھے " اس فائدے کو جو مزید نقد کے ہاتھ میں رکھنے سے مل سکتا ہے اس نقصان سے مقابلہ کرتا ہے جو ذرائع کو ایسی شکل میں رکھنے سے جس سے نہ تو کوئی براہ راست فائدہ ہوتا ہے، نہ آمدنی میں اضافہ اور پھر کوئی فیصلہ کرتا ہے۔"

"اب فرض کیجیے کہ کسی ملک کے بسنے والے مل کر (جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں) یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے پاس اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اور اپنی دوسری ملکیتوں کا پچاسواں حصہ نقد کی شکل میں رکھیں تو اس ملک میں کل کرنسی کی قیمت ان دونوں کے مجموعہ کے برابر ہوگی۔"

پروفیسر مارشل نے ایک فٹ نوٹ میں یہ بھی بتایا ہے کہ پرانے مصنف اس معاملے پر اسی طرح بحث کرتے آئے ہیں چنانچہ پٹی کے خیال میں زر کی وہ مقدار ملک کیلیے مناسب تھی "جس سے

(باقی نوٹ صفحہ ۱۰۰ پر)

متعین ہوگی۔ ایک معمولی سی مثال سے یہ بات پوری طرح ذہن میں آجائے گی۔ فرض کیجئے ہمارے ملک میں محض گیہوں استعمال ہوتا ہو اور اس لئے لوگوں کو اپنی کل ضروریات زندگی گیہوں سے ہی پوری کرنی ہوتی ہیں۔ فرض کیجئے گیہوں کی سالانہ پیداوار ایکہزار ٹن ہوتی ہے اور ملک میں ایک ایک روپے کے (اور کسی طرح کے نہیں) ۵۰۰ نوٹ ہیں، یعنی لوگ اپنی حقیقی آمدنی کا نصف حصہ نقد کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں تو اب ایک ٹن گیہوں کی قیمت ۲ روپے ہوگی، کیونکہ ایکہزار ٹن گیہوں خریدنے کے لئے ۵۰۰ روپے کی ہی رقم موجود ہے (اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ گیہوں کی صرف آدھی مقدار استعمال کریں گے، مطلب محض یہ ہے کہ

انگلستان کی کل زمینوں کی آدھی لگان، مکانوں کا چوتھائی کرایہ، لوگوں کا ایک ہفتہ کا خرچ، اور برآمد کردہ چیزوں کی ایک چوتھائی کی قیمت چکائی جا سکے۔ لاک نے اندازہ لگایا کہ اگر کرنسی کی مقدار اجرتوں کا پچاسواں حصہ، زمین داروں کی ایک چوتھائی آمدنی اور بروکروں کی سالانہ آمدنی کے بیسویں حصے کے برابر ہو تو ملک کی تجارت کا کام اچھی طرح چل جائے گا"۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں کنیٹاں نے نتیجہ نکالا کہ کرنسی کی قیمت ملک کی پیداوار کے نویں حصے کے برابر یا زمینوں کی لگان کے (یہ دونوں اس کے خیال میں برابر ہیں) ایک تہائی کے برابر ہونی چاہئے۔ ایڈم سمتھ کی رائے یہ تھی کہ اس تناسب کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں کیمشن نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ زر کی مجموعی مقدار آجکل کے زمانہ میں قومی آمدنی کے دسویں یا پندرہویں حصے کے برابر ہوتی ہے۔

یورپ اور خاصکر انگلستان میں نظریۂ مقدار کی یہ شکل زیادہ مقبول ہے۔

لوگ اپنی حقیقی آمدنی کے نصف کے برابر روپے رکھنا مناسب سمجھتے ہیں، اور چونکہ ہر چیز بکنے یا استعمال ہونے کیلئے ہی پیدا کی جاتی ہے اس لئے کل پیداوار (اتنے میں ہی بکتی ہے) پہلے اسکول کی طرح یہ دوسرا اسکول بھی اس نظریے کو الجبرا کی مدد سے پیش کرتا ہے۔ آئیے اب اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرلیں۔

فرض کیجئے کسی ملک کی سالانہ آمدنی "ح" کے برابر ہے "ح" کا استعمال اس لئے کیا گیا ہے کہ اس نظریے میں کینس کے بقول اہم چیز قوت خرید کا وہ حصہ ہے جو لوگ اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس قوت خرید کا اندازہ کسی ایسی اکائی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جس میں عام استعمال کی چیزیں یا ایسی چیزیں جن پر لوگ پیسے خرچ کرتے ہیں کسی خاص معیار کے مطابق شامل ہوں۔ یہاں ہم نے "ح" کا استعمال اس لئے کیا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ہم جس چیز سے بحث کر رہے ہیں وہ حقیقی آمدنی ہے۔ "ن" وہ زر کی وہ مقدار ہے جو لوگ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے کی طرح "ز" سے مراد زر کی کل مقدار ہے جو سوسائٹی میں موجود ہے۔ تو چونکہ زر کی کل مقدار کی قیمت حقیقی آمدنی کے اس حصے کے برابر ہوگی جو لوگ اپنے پاس رکھتے ہیں اس لئے ز = ن۔ح اس لئے ایک روپے کی قیمت = $\frac{ن\ ح}{ز}$

ایک روپے کی قیمت کا دارومدار ظاہر ہے چیزوں کی قیمت پر ہوگا، اگر قیمتیں بڑھ جائیں تو زر کی قیمت گھٹ جائے گی، اگر قیمتیں گھٹ جائیں تو روپے کی قیمت بڑھ جائیگی، اس لئے اس ایکویشن میں قیمتوں کے تصور کو لانے کے لئے اسکی شکل بدلنی ہوگی، آخری شکل یہ ہے۔ ق = $\frac{ز}{ن\ ح}$ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس ایکویشن میں ہم قیمت کے جس تصور سے بحث کر رہے ہیں وہ اس سے مختلف ہے،

جس سے ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔ پہلے ایکویشن میں ہم نے ان تمام چیزوں کی قیمتوں کو شامل کیا تھا جن کا سودا ہوتا ہے، یا جو زر کے بدلے میں خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اب ہمیں محض ان چیزوں کی قیمتوں سے واسطہ ہے جو سوسائٹی کی حقیقی آمدنی کا حصہ ہیں، یعنی ان چیزوں کی قیمتیں جو ہم اس لئے خریدتے ہیں کہ انہیں استعمال کریں، ان سے لطف اندوز ہوں۔ ان چیزوں کی قیمتیں نہیں جو بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہیں یا جن کی مدد سے وہ چیزیں بنتی ہیں جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ قیمتوں کا یہ تصور بھی ظاہر ہے ہر شخص کیلئے ایک سی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ سوسائٹی میں مختلف طبقوں کے استعمال کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں اور مصارف زندگی کا کوئی ایسا انڈکس نہیں بنایا جا سکتا جو ان تمام طبقوں کیلئے یکساں کام دے۔ پھر بھی قیمت کا یہ تصور اس سے بہتر ہے جس سے ہم نے پچھلے ایکویشن میں بحث کی تھی، اس دوسرے ایکویشن کی ایک خوبی یا برتری یہی ہے کہ اس میں ہم جن قیمتوں سے بحث کرتے ہیں اُن کا تصور اہم اور ذومعنی ہے۔

ہم نے نظریۂ مقدار کے پہلے ایکویشن سے بحث کرتے وقت اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زر کی مقدار میں تبدیلیوں کی تلافی گردش کے زور کی تبدیلیوں سے ہو سکتی ہے۔ پچھلی عالمگیر کساد بازاری کے دوران میں امریکن حکومت نے زر کی مقدار میں اضافے کے ذریعے اس کا علاج کرنا چاہا تو یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ گردش کے زور میں جو تبدیلی ہوئی اُس نے زر کی مقدار میں اضافے کے اثر کو ہلکا کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ کبھی تو زر کی شکل میں زیادہ قوت خرید رکھنا پسند کرتے ہیں اور کبھی کم۔ نظریۂ مقدار کے اس دوسرے ایکویشن سے اس سوال پر روشنی پڑتی ہے۔ جب چیزوں کی قیمتوں میں

اضافہ ہو رہا ہو تو فائدہ اس میں ہوتا ہے کہ روپے کو چیزوں میں بدل لیا جائے کیونکہ ایسے زمانے میں اور سبھی چیزوں کے دام بڑھتے ہیں اور زر کی قیمت گھٹتی ہے، کیونکہ زر کی کسی مقدار سے جو چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں اُن کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ اس لئے خوش حالی یا افراط زر کے زمانے میں زر کی مقدار میں اضافے کے ساتھ ساتھ گردش کے زور میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہ صورت زیادہ نفع کی ہے کہ روپے کو اس کی قیمت کے گھٹنے، یا دوسرے الفاظ میں عام قیمتوں کے بڑھنے سے پہلے چیزوں کی شکل میں بدل لیا جائے، اس کے برخلاف جب سب قیمتیں گر رہی ہوں تو ایک زر کی قیمت ہی ایسی ہوتی ہے جس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے دنوں میں زیادہ نفع کا سودا یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کے بجائے روپے جمع کئے جائیں کیونکہ دن بدن انکی قیمت یا قوت خرید میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہاں ایک بات ذہن میں رکھنا چاہئے۔ گردش کے زور میں کمی بیشی، یا ہمارے پہلے ایکویشن کے "گ" اور اس دوسرے ایکویشن کے "ن" (یا حقیقی آمدنی کا وہ حصہ جو لوگ روپے کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں) میں گہرا تعلق ہے۔ اگر لوگ اپنی حقیقی آمدنی کا بڑا حصہ روپے کی شکل میں رکھنے کا فیصلہ کرلیں تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ گردش کے زور میں کمی آ جائے گی، اگر لوگوں کا فیصلہ اس سے مختلف ہو تو گردش کے زور پر اس کے خلاف اثر پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں کا باہمی رشتہ تضاد کا ہے، ایک میں کمی ہو تو دوسرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پروفیسر چینڈلر نے کہا ہے اس دوسرے ایکویشن کو وہی شکل دی جا سکتی ہے جو پہلے ایکویشن کی ہے۔ لیکن پھر بھی ان دونوں میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ اور وہ فرق

یہ ہے کہ محض یہ کہدینے سے کہ خوش حالی اور کساد بازاری کے دنوں میں گردش کے زور میں زیادتی یا کمی ہو جاتی ہے مسئلے کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اس کا جواب ہمیں اس دوسرے ایکویشن سے ملتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ دوسری سبھی چیزوں کی طرح سوسائٹی کے افراد زر کی اہمیت کا بھی اندازہ لگاتے ہیں اور اندازے کے پیش نظر زر کی مانگ متاثر ہوتی رہتی ہے۔ جب زر کی قیمت بڑھتی ہے تو زر کی مانگ بڑھ جاتی ہے، جب اس قیمت میں کمی آجاتی ہے تو مانگ بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس دوسرے ایکویشن کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ اس میں زر کی قیمت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے طور پر زر کو کیا اہمیت دیتے ہیں اس لئے یہ نظریہ عام نظریۂ قدر سے قریب تر ہے کیونکہ اس میں بھی فیصلہ کن عنصر یہی بتایا جاتا ہے کہ لوگ مختلف چیزوں کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ اس ایکویشن میں زر کی طلب اور رسد پر تعین قیمت کا دار و مدار بتایا گیا ہے اس لئے اس حیثیت سے بھی اسے برتری حاصل ہے کیونکہ اس طرح زر کے مسائل عام معاشی مسائل سے قریب تر آجاتے ہیں۔

لیکن ہم نے یہ دیکھا تھا کہ پہلے ایکویشن کی کمزوری یہ تھی کہ اس کی مدد سے ہم

یہاں ایک شبہے کا دور کر دینا ضروری ہے جو پڑھنے والے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے جب ہم نے نظریۂ مقدار کے ایک ایکویشن کا ذکر کیا تھا تو زر کی مقدار کا اندازہ کرنے میں ہر قسم کے زر کو شامل کیا تھا، اس دوسرے نظریے کے سلسلے میں بھی زر کی رسد کے سلسلے میں ان تمام قسموں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن بعد کی گفتگو میں بار بار اس ذکر سے بچنے کیلئے کہ لوگ چھوٹے سکے، بنکوں میں امانتیں اور حکومت کے سکے رکھنے میں محض یہ کہدیا گیا ہے کہ لوگ نقد یا روپے کی کوئی مقدار رکھنا چاہیں گے اس سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ نقد کا ذکر ہو یا روپے کا مطلب ان سبھی قسموں کے زر سے ہے۔

چھوٹے عرصے کی تبدیلیوں کی وضاحت نہیں کر سکتے آئیے اب یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اس دوسرے ایکویشن سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے یا نہیں۔
فرض کیجئے زر کی مقدار میں اضافہ کیا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے ہاتھ میں زیادہ روپے آئیں گے۔ اگر قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہوگیا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے ہاتھ میں قوت خرید زیادہ ہو جائے گی۔ اگر زر کی رسد کی مقدار میں اضافے کے ساتھ ساتھ مانگ میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ تو نئے زر کے پانے والے یہ سوچیں گے کہ ان کے پاس جو رقمیں ہیں وہ ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اور اس فاضل رقم کو لوگ چیزوں کی شکل میں بدلنا چاہیں گے اور حصے خریدیں گے، یا عام استعمال کی چیزیں وغیرہ۔ گویا ان مختلف چیزوں کیلئے ان کی مانگ میں اضافہ ہوگا، اس اضافے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی قیمتیں بڑھیں گی، جن لوگوں سے یہ چیزیں خریدی جائیں گی اُن کے پاس بھی روپے کی رقم پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہو جائے گی۔ وہ بھی کچھ چیزیں زیادہ مقدار میں خریدنا چاہیں گے، اور ان چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوگا کیونکہ جب کسی چیز کی مانگ میں اضافہ ہو تو اس کی قیمت میں فوری اضافہ ناگزیر ہوتا ہے۔ اب یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اگر سب نہیں تو بیشتر قیمتوں میں اضافہ نہ ہو لے۔
اب اگر زر کی مانگ میں اضافہ نہ ہو تو قیمتوں میں یہ اضافہ زر کی مقدار میں اضافے کے تناسب سے ہوگا۔

"لیکن اس ردوبدل کے دوران میں زر کی مانگ میں اضافہ ضروری ہوگا۔ اس اضافے کی مقدار کے متعلق کچھ کہنا اس لئے مشکل ہے کہ زر کی مقدار میں

اضافے سے اس کی مانگ پر دو گونہ اثرات پڑیں گے۔ ایک اثر تو یہ ہوگا کہ جب لوگوں کے اخراجات بڑھیں گے تو گویا مختلف چیزوں کی مانگ بڑھے گی، مانگ کے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پیداوار بڑھے گی، یعنی حقیقی آمدنی کی مقدار بڑھے گی اب اگر اس تناسب میں کوئی کمی یا زیادتی نہ ہو جس میں لوگ اپنی حقیقی آمدنی کا کوئی حصہ روپے کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں تو بھی زر کی مانگ بڑھے گی، اس کے برخلاف ہم نے یہ دیکھا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافے سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مہنگائی کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ بجائے زر کے چیزیں حاصل کرنا بہتر سمجھیں گے کیونکہ اب زر کی قیمت گھٹ رہی ہے اس لئے اس کی اہمیت بھی لوگوں کیلئے کم ہو جائے گی۔ اگر زر کی قیمت میں بہت زیادہ کمی کا اندیشہ ہو تو زر کی مانگ بہت کم بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں افراط زر کے حالات بہت خراب ہو گئے تو جرمنی کے چھوٹے دکاندار اور مزدور بس دو تین دن کی ضرورتوں کے پورا کرنے بھر زر اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس بات سے اس مسئلے پر اچھی روشنی پڑتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جب زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے تو قیمتیں پہلے آہستہ آہستہ بڑھتی ہیں اور پھر تیزی سے۔

" اوپر کی گفتگو چھوٹے عرصے کے متعلق تھی لیکن اگر موضوع بحث کوئی لمبی مدت ہو تو زر کی مقدار میں اضافے کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ ہو جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی لمبی مدت اگر ذہن میں رکھی جائے تو اس عرصے میں ضروری تبدیلیاں ہو جائیں گی اور جہاں تک زر کی مانگ کا

تعلق ہے وہ زر کی رسد کے بجائے دوسرے بنیادی اسباب سے متعین ہوگی۔ زر کی مقدار میں کمی کے نتائج پر تفصیل سے بحث کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس کے نتائج اس کے اُلٹے ہوں گے۔ لیکن اس گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ زر کی قیمت میں تبدیلی زر کی مانگ میں کمی بیشی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ تجارت کی مقدار میں کمی بیشی یا اس وجہ سے کہ مستقبل کے متعلق یہ خیال پیدا ہو جائے کہ عام قیمتیں بہت گھٹیں بڑھیں گی تو زر کی مانگ میں بہت تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اور اگر زر کی رسد میں اسی تناسب سے تبدیلی نہ کر دی جائے تو قیمتوں پر لازماً اثر پڑے گا۔ مثلاً اگر اندیشہ ہو کہ قیمتیں بڑھیں گی یعنی زر کی قیمت گھٹے گی تو روپے ہاتھ میں رکھنے سے لوگ بچیں گے، اب اگر روپے کی مقدار میں کمی نہ کی گئی تو قیمتوں میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ لوگ اپنی "فاضل" رقمیں لیکر بازار سے چیزیں خریدنے کی کوشش کریں گے تاکہ زر کی قیمت میں مزید کمی سے پہلے کچھ ایسی چیز حاصل کر لیں جس کی قیمت بڑھے گی اور اس طرح خرچ میں اضافہ ہوگا اور قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ زر کی مجموعی قوت خرید گھٹ کر اس حد کو پہونچ جائے جو اب زر کی مانگ کی تبدیلی کے بعد سوسائٹی چاہتی ہے۔ زر کی مانگ میں اضافے کے اثرات کم وبیش اس کے الٹے ہوں گے۔ اگر آپ مزید رقم اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں تو لازماً آپ کو اپنے مصارف میں کمی کرنی ہوگی، اور اسکی وجہ سے قیمتوں میں کمی لازمی ہوگی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ زر کی مانگ میں کمی بیشی کی بدولت بھی قیمتوں میں تبدیلی ایک بار شروع ہو کر پھر خود اپنی پیدا کردہ قوتوں کے سہارے بڑھتی پھیلتی رہ سکتی ہے۔"

لیکن اس ایکویشن کی مدد سے بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تجارتی چکر سے متعلق جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کا سبب کیا ہے۔ اس سے اس سوال پر تو روشنی پڑتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ قیمتوں میں کمی شروع ہو جائے تو پھر یہ سلسلہ کچھ عرصے تک قائم رہتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قیمتوں میں تبدیلیوں کا آغاز کیوں کر ہوتا ہے؟ کساد بازاری کا آغاز ہوتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ زر کی مقدار میں اچانک بہت کمی ہو جاتی ہو، ہوتا یہ ہے کہ گردش کے زور میں کمی (یا "ن" کے تناسب میں) اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ہمارے دونوں ایکویشن اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں لیکن دونوں سے علاج کی ایک صورت نکلتی ہے۔ اگر "گ" یا "ن" میں تبدیلی ہوتی ہے تو حل یہ ہے کہ زر کی مقدار میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو ان تبدیلیوں کی تلافی کر دے۔ لیکن اس نسخے کی کارگری کے متعلق بہت پُر امید نہیں ہوا جا سکتا کیونکہ پچھلی کساد بازاری کے دنوں میں اس پر عمل کیا جا چکا ہے اور یہ ناکامیاب رہا ہے۔ ہاں تاریخ سے ایسی شہادتیں تو ملتی ہیں جب زر کی مقدار میں اضافے پر پابندی کی وجہ سے قیمتوں میں کمی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی تاریخ سے ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جب زر کی مقدار میں اضافے کرنے کی کوشش سے قیمتوں میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہو سکتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ نظریۂ مقدار کی مدد سے ہم بڑی مدت کی تبدیلیوں کی توضیح کر سکتے ہیں، کبھی کبھی بعض مخصوص قسم کی وہ تبدیلیاں بھی جو تھوڑی مدت میں واقع ہو جاتی ہیں اس کی مدد سے سمجھی سمجھائی جا سکتی ہیں لیکن تجارتی

چکر کے سمجھنے میں ہمیں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ مثلاً امریکہ میں پچھلی بڑی کساد بازاری کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ زر کی گردش کے زور میں کمی آگئی تھی، لیکن یہ کمی کیوں ہوئی اس کا جواب ہمیں نہیں ملتا۔ بدلے ہوئے حالات میں زر کے مسائل سے بحث کرنے والوں اور ماہرین معاشیات کی توجہ کا مرکز اب تجارتی چکر کا سوال بن گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ نظریۂ مقدار کو بھول چکے ہیں، یا کم سے کم اسے بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ نظریہ زر کے مسائل کو سمجھنے کی پہلی کوشش ہے اس لئے اب بھی اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

جیسا کہ کراؤتھر نے کہا ہے نظریۂ مقدار میں دو بڑی کمزوریاں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس نظریے کے ماننے والے زر کی مقدار کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، دونوں ہی اکویشن ہمیں یہ رشتہ دکھاتے ہیں کہ زر کی مقدار میں کمی بیشی سے قیمتوں میں کمی زیادتی کی جا سکتی ہے۔ قیمتوں کو اس طرح متاثر کرنا بعض صورتوں میں ممکن ہے بعض صورتوں میں نہیں۔ فرض کیجئے کوئی ملک کساد بازاری کے حالات سے باہر نکل رہا ہے، یہ اصلاح کیوں کر ممکن ہوئی ہم اس سے بحث نہیں کر رہے ہیں۔ اب نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار بڑھے گی، اگر ایسے میں زر کی مقدار میں اضافہ کیا جائے تو یہ ضروری نہیں ہوگا کہ قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو کیونکہ اس صورت میں بے کار ذرائع پیداوار کی کافی مقدار موجود ہوگی، اور انہیں کام میں لایا جائے تو بڑے پیمانے پر چیزوں کی تیاری ممکن ہوگی، اگر اس طرح مصارف پیداوار میں کمی ہو جائے تو

بجائے قیمتوں میں اضافے کے کمی واقع ہو سکتی ہے، دوسرے الفاظ میں یہ ضروری نہیں کہ اگر زر کی مقدار میں اضافہ ہو اور اسی لحاظ سے لوگوں کے صرف میں تو قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ ہو۔ ہاں اگر ذرائع پیداوار سے پورا پورا کام لیا جارہا ہو اور اس صورت میں زر کی مقدار میں اضافہ ہو تو پھر قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ ہو سکتا ہے، بلکہ ایسا ہونا ناگزیر ہوگا۔

نظریۂ مقدار کی دوسری خامی یہ ہے کہ قیمتوں کی تبدیلی کو اس کے ماننے والے بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ہم پہلے یہ دیکھ چکے ہیں کہ قیمتوں میں تبدیلیوں سے پیداوار اور تقسیم دولت پر بہت نمایاں اثرات پڑ سکتے ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ خوش حالی اور کساد بازاری کا سبب قیمتوں کی زیادتی اور کمی ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ تجارتی خوش حالی کے زمانے میں قیمتوں میں اضافے ہوتے ہیں اور کساد بازاری کے زمانے میں کمی، یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مرتبہ قیمتیں گھٹنے بڑھنے لگیں تو ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ قیمتوں میں کمی زیادتی کا دور کچھ عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ لیکن قیمتیں بڑھتی یا گھٹتی کیوں ہیں؟ اب ہمیں اس سوال کا جواب ڈھونڈنا چاہئے۔ قیمتوں میں اضافے کی صورت یہ ہے کہ یا تو چیزوں کی مانگ میں اضافہ ہو، یا چیزوں کی پیداوار میں کمی۔ خوش حالی کے دنوں میں پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے کمی نہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ قیمتوں میں اضافہ کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مانگ بڑھتی ہے۔ چیزوں کی مانگ میں اضافے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے پاس اس اضافے کیلئے زیادہ قوت خرید آگئی ہے۔ اس کے برخلاف قیمتوں میں کمی اس لئے ہو سکتی ہے کہ

چیزوں کی مانگ کم ہو جائے یا چیزوں کی پیداوار بڑھ جائے۔ کساد بازاری کے دنوں میں پیداوار گھٹتی ہے، بڑھتی نہیں، اس لئے یہ ظاہر ہو گیا کہ قیمتوں میں کمی مانگ میں کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں چیزوں کی قیمتوں میں خوش حالی کے زمانے میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ اس لئے کہ چیزوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ یعنی زر کی مقدار میں یا گردشں کے زور میں اضافے (یا "ان" میں کمی) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں زیادہ قوت خرید آ جاتی ہے، اور وہ اس سے کام لیتے ہیں تو چیزوں کی مانگ بڑھتی ہے، اس کے برخلاف کساد بازاری کے زمانے میں لوگوں کے ہاتھ میں کم قوت خرید آتی ہے اور اس لئے قیمتیں گرتی ہیں۔ تجارتی چکر کے سوال کو حل کرنے کے لئے ہمیں جس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے وہ یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مختلف چیزوں کی پیداوار کی مانگ ان کی رسد کے مقابلے میں کم ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھی اتنی زیادہ کم کہ رسد سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جب چیزوں کی مانگ بڑھ رہی ہو تو زر کی مقدار میں کمی کر دینے سے اضافۂ قیمت کو روک دیا جائے کیونکہ اس طرح لوگوں کے ہاتھ میں قوت خرید کی مقدار کو کم کر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر آج زر کی مقدار اچانک آدھی کر دی جائے تو لازمی نتیجہ ہو گا کہ مجھے اور آپ کو اپنی خریداریاں کم کرنی پڑیں گی اور قیمتوں میں اضافہ ناممکن ہو جائیگا۔ لیکن ہمیں عملی زندگی میں کساد بازاری کے جن مسائل سے واسطہ پڑتا ہے اُن کے آغاز کے متعلق یہ کہنا ناممکن ہے کہ زر کی مقدار میں کمی ان کا سبب ہے۔ مثال کے طور پر پچھلی عالمگیر کساد بازی کا آغاز امریکہ میں ہوا تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ زر کی مقدار

میں کمی ہوگئی تھی؛ حقیقتاً ۱۹۳۲ء میں بہت سے ملکوں میں زر کی مقدار ۱۹۲۹ء سے زیادہ تھی۔ اسی طرح جب کساد بازاری کا دور ختم ہوا تو اس کا سبب زر کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں تھا۔" ان شہادتوں کی موجودگی میں ایک ہی نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا اور وہ یہ ہے کہ مانگ کی اچانک کمی جس سے کساد بازاری کا آغاز ہوتا ہے لوگوں کی آمدنیوں میں کمی کی بدولت ہوتی ہے۔ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ خرچ میں کمی اس چیز کی ذمہ دار ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کساد بازاری میں زیادہ پیسے نہ خرچ کرنے کا سو میں سے ننانوے حالتوں میں سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس خرچ کرنے کو پیسہ نہیں ہوتے، یہ وجہ نہیں ہوتی کہ وہ خرچ کرنا نہیں چاہتے۔" اس کے باوجود جیسا کہ ہیری ولرڈ نے کہا ہے نظریۂ مقدار کے یہ اکویشن اس لحاظ سے مفید ہیں کہ ان کی مدد سے قیمتوں پر پڑنے والے مختلف اثرات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے؛ اس نقطۂ نظر کی اہمیت یہ تھی کہ وہ بہت سے مختلف اثرات کو محض تین سرخیوں کے تحت بتاتا تھا۔ دوسرا اکویشن اس لحاظ سے پہلے کے مقابل میں کچھ برتر ہے کیونکہ اس میں زیادہ زور "ن" پر تھا اور اسکی تعریف یہ تھی کہ یہ وہ تناسب ہے جو لوگ اپنی آمدنی اور زر کی اس رقم کے درمیان رکھتے ہیں، اس طرح وہ قیمت جس پر دوسرے اکویشن میں بحث کی جاتی تھی حالیہ پیداوار کی قیمت تھی جسے دوسرے الفاظ میں ہم قومی آمدنی کا بھی نام دے سکتے ہیں۔ یہ تعلق گردش کے زور سے زیادہ کارآمد ہے کیونکہ یہ رشتہ زیادہ "اہم" ہے موجودہ رجحان یہ ہے کہ ان بنیادی عناصر آمدنی اور خرچ کی مدد سے اس مسئلے کی توضیح کی کوشش کی جائے جو آج سب کی توجہ کا مرکز ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی یہ عادت کہ کبھی پیداوار بہت بڑھتی ہے اور کبھی گھٹ جاتی ہے [illegible]

پانچواں باب

نظریۂ آمدنی و خرچ

پچھلے باب میں ہم اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ خوش حالی اور کساد بازاری یا قیمتوں میں اضافے اور کمی کے سبب کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں زر کی مقدار کی زیادتی اور کمی کے بجائے یہ دیکھنا چاہئے کہ لوگوں کی آمدنی میں زیادتی اور کمی کیوں اور کیسے ہوتی ہے۔ آمدنی اور خرچ کے نظریے کی مدد سے ان سوالات کی توضیح کی جا سکتی ہے۔ اس نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ ترقی پچھلے کچھ دنوں میں ملی ہے، لیکن اس کی داغ بیل اٹھارہویں صدی میں ہی پڑ چکی تھی۔ انیسویں صدی میں اسے زندہ رکھنے کی ذمہ داری اس بحث پر ہے جو اس سوال پر ہوتی رہی ہے کہ "سرمایہ دارانہ نظام میں اتنی آمدنی لوگوں کو ہو جاتی ہے یا نہیں کہ جو کچھ پیدا ہو ایسی قیمتوں پر بک جائے جن سے نفع ہو۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ اس نظام میں قوت خرید کی کمی ہوتی ہے اور اس کی بدولت مزدور اور دوسرے ذرائع پیداوار بیکار رہنے پر مجبور ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجموعی پیداوار اس سے کم ہوتی ہے جتنی ملک میں پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے"۔ اس بحث کے دوران میں جو سوالات اٹھے یا دلیلیں دی گئیں انھیں سمجھ لیا جائے تو نظریہ زر کے متعلق موجودہ "آمدنی و خرچ" کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے گی۔

اس سوال پر کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت لوگوں کے ہاتھ میں کافی قوت خرید (یا آمدنی) آجاتی ہے یا نہیں۔ دو رائے کے لوگ ملتے ہیں۔ کلاسیکل اسکول کے بعض ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ قوت خرید کی کمی کا واقع ہونا تو الگ رہا اس رجحان کا امکان بھی نہیں کہ سوسائٹی میں قوت خرید کافی نہو اس رائے کے مخالف کئی طرح کی رائیں رکھتے ہیں لیکن ان میں اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت یہ بالکل ممکن ہے کہ خریداریاں اتنی کم ہو جائیں کہ بے روزگاری پھیل جائے اور معاشی نظام اپنی بھرپور صلاحیت کے لحاظ سے کام نہ کر سکے۔ اس رائے کے کچھ حامیوں کا خیال ہے کہ کبھی کبھی جیسا کہ کساد بازاری کے حالات کے پیدا ہونے سے ثابت ہوتا ہے ایسا ہو سکتا ہے کہ قوت خرید کی کمی ہو جائے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے جب قوت خرید کی تقسیم اتنی کافی مقدار میں ہو جاتی ہے کہ خوش حالی کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری کے تحت ”عام کثرت پیداوار“ کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جب یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں جتنی قوت خرید آتی ہے وہ کل پیداوار کے خریدنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ کساد بازاری کے دنوں میں تو ایسا ہوتا ہی ہے، نام نہاد خوش حالی کے زمانے میں بھی قوت خرید کے ناکافی ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار اس حد تک نہیں پہونچ پاتی جہاں تک فنی معلومات اور سرمائے کے اکھٹا ہو جانے سے اسے پہونچایا جا سکتا ہے۔ اس دوسرے خیال کے ساتھ کارل مارکس کا نام وابستہ ہے، معاشیات کے بہت سے ماہر بھی جو دیسے کارل مارکس کے خیالات سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے اس رائے کے حامی ہیں

میں گنے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح اس بارے میں بھی بہت اختلاف رائے ہے کہ اس رجحان کا کہ قوت خرید، یا عام مانگ میں کمی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ پر کل پیداوار کا فروخت ہونا ناممکن ہو جاتا ہے بنیادی سبب کیا ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ معاشی توسیع کی یہ لازمی خصوصیت ہے کہ پیداوار کی صلاحیت میں اس پیداوار کے لئے خرچ میں، اضافے سے زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پیداوار کی صلاحیت تو زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے لیکن اس بڑھتی ہوئی پیداوار کو اتنی ہی تیزی سے خریدا نہیں جاتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ پیداوار کی وجہ سے قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور نفع کی امید کم ہو جاتی ہے، اور اس لئے پیداوار گھٹائی جاتی ہے اور نتیجہ بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجموعی طلب کی مقدار کے ناکافی یا کم ہونے کا سبب دولت کے پس انداز کرنے کی خصوصیت میں ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ جو دولت پس انداز ہو جاتی ہے وہ کسی چیز کی خریداری کیلئے استعمال ہی نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی آمدنی کا ایک حصہ چیزوں کی خریداری کے لئے استعمال ہی نہیں ہوتا۔ اور اتنی چیزوں کی مانگ ختم ہو جاتی ہے کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ رائے تو صحیح نہیں ہے کہ جو دولت پس انداز کی جاتی ہے وہ کسی کام ہی نہیں آتی کیونکہ دولت کے پس انداز کرنے والے اس سے ایسی چیزیں خریدتے ہیں جن سے انہیں مستقبل میں آمدنی کی امید ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کچھ پیسے بچا کر ایک مشین خرید لے

جو مثلاً کپڑا بنا سکے تو دولت کے پس انداز کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ آئ
کپڑا تیار کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن جو روپے اس مشین میں لگ
وہ اب کپڑا خریدنے کے کام نہیں آ سکتے۔ اس لئے دولت کے پس انداز کر
گویا دو نتیجے ہوتے ہیں، پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ اور دوسری طرف
عام استعمال کی چیزوں کی مانگ میں کمی، اور اس لئے دولت کے پس انداز
سے بے روزگاری کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں لوگوں میں
کم و بیش اتفاق رائے ہے کہ موجودہ نظام کے تحت دولت کی غیر مساوی تق
دولت کے پس انداز کرنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں انھیں مدد ملتی ہے۔

کلاسیکل اسکول کے ماننے والوں کی رائے میں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے
"پیداوار میں عام کثرت" ممکن نہیں لیکن اس اصلاح کو کئی معنے دئیے گئے ہیں
مثال کے طور پر ایڈم اسمتھ کی یہ رائے دیکھیے۔ "جہاں تک غذا کی مانگ کا
تعلق ہے اس کی مقدار کی ایک حد ہے کیونکہ ہر آدمی اتنا ہی کھا سکتا ہے جتنا
اُس کے پیٹ میں سما سکے۔ لیکن زندگی کی مختلف آسائشوں کے لیے مختلف چیز
کی خواہش ہوتی ہے، مثلاً مکان کو خوبصورت طور پر سجانے کے لیے مختلف چیزوں
لباس اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی خواہش کی ایسی کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی
دوسرے الفاظ میں اسمتھ کا کہنا یہ تھا کہ آدمی کی خواہشیں ان گنت اور لا تعداد
ہیں۔ ان گنت خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے لا تعداد چیزوں کے بنانے کی ضرورت
ہوگی اس لیئے یہ کہنا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی مقدار میں چیزیں بن سکتی ہیں کہ
لوگوں کی خواہشوں سے بھی زیادہ ہو جائیں صحیح نہیں ... معنی ... کلاسیکل ...

رائے یقیناً صحیح تھی لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں چیزیں اس لئے نہیں بنتیں کہ لوگوں کو ان کی خواہش یا ضرورت ہوتی ہے، چیزوں کے بنانے سے پہلے مل مالک جو بات سوچتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا اس کے فروخت کرنے میں اسے نفع ہوگا یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں وہ جو چیز بنانا چاہتا ہے اس کے خریدار ہوں گے یا نہیں؟ اور خریدار ہونے کے لئے ضروری شرطیں یہ ہیں کہ آپ کوئی چیز لینا چاہیں، آپ کی جیب میں اس کے دام کے پیسے بھی ہوں، اور آپ انھیں خرچ بھی کرنا چاہیں، اگر آپ کے پاس پیسے نہ ہوں، یا آپ انھیں کسی خاص چیز کے لئے خرچ نہ کرنا چاہیں تو چاہے آپ کو کسی چیز کی کتنی بھی خواہش ہو آپ کے لئے کوئی مل مالک کوئی چیز بھی نہیں بنائیگا۔ اس لئے بحث یہ ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پیداوار کی مقدار اس سے زیادہ ہو جتنا کہ لوگ خرید سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ظاہر ہے کہ کچھ چیزیں نہیں بکیں گی، اور ان کے بنانے والوں کو نقصان ہوگا اور پھر وہ ان کا بنانا بند کر دیں گے جس کے نتیجے میں بے روزگاری لازمی ہوگی کیونکہ وہ مزدور بے کار ہو جائیں گے جو یہ چیزیں بنانے کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کلاسیکل اسکول کے ماہرین معاشیات اس معنی میں بھی "کثرت پیداوار" کے قائل نہیں تھے۔ وہ یہ تسلیم کر لیتے تھے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک چیز یا چند چیزوں کی مانگ اور ان کی پیداوار میں ایسی تبدیلیاں ہو جائیں کہ پیداوار زیادہ ہو جائے لیکن ایسی صورت میں اگر چند چیزوں کی پیداوار زیادہ ہو تو کچھ ایسی بھی چیزیں ہوں گی جن کی پیداوار کم ہوگی۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ محنت کا استعمال غلط ہو اور غلط چیزیں پیدا ہو سکیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ ہر چیز کی پیداوار کی کثرت ہو جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ محنت کچھ بہت

پسندیدہ چیز نہیں۔ لوگ محنت اس لئے کرتے ہیں تاکہ کچھ چیزیں براہِ راست استعمال کے لئے حاصل کر سکیں، یا کچھ چیزیں تیار کر کے ان کے بدلے میں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں چیزوں کی رسد اور مانگ میں کوئی فرق ممکن نہیں، یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگر چیزوں کی رسد میں کوئی اضافہ ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوگا کہ ان چیزوں کے بنانے والے دوسری چیزوں کی زیادہ مقدار حاصل کرنا چاہیں گے۔ یہ فرض کرنا کہ لوگ ایسی چیزیں بنانے میں محنت کریں گے جنھیں نہ تو وہ خود استعمال کرنا چاہیں، نہ ان کی مدد سے دوسری چیزیں حاصل کرنا مہمل سی بات ہے۔ زر کے استعمال سے دو چیزوں کے آپس میں مبادلے میں ایک درمیانی چیز آجاتی ہے، اور خرید و فروخت کا کام بالواسطہ سا ہو جاتا ہے، لیکن اس سے اصل تصویر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تجارت کا مقصد اب بھی ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز حاصل کرنا ہوتا ہے زر کے استعمال سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ اب چیزیں روپے کے عوض میں بیچی جاتی ہیں، اور پھر ان روپیوں سے دوسری چیزیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اس رائے کے حامیوں میں جے۔ بی۔ "سے" کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ سے کی ایک تحریر کے اقتباس سے اس پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

"جوں ہی کوئی چیز بن کر تیار ہوتی ہے، مختلف چیزوں کے لئے اس کی قیمت بھر طلب بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مکمل کرتے ہی اس کا بنانے والا اسے نفع سے بیچنے کی فکر میں لگ جاتا ہے تاکہ کہیں اس کی قیمت میں کمی سے اسے نقصان نہ ہو، اور

کر دینا چاہتا ہے کیونکہ زر کی قیمت میں بھی کمی ہو سکتی ہے لیکن روپے خرچ کر دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ ان کی مدد سے کوئی چیز خرید لیں۔ اس طرح کسی چیز کی تیاری خود اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ کسی اور چیز کی طلب کے لیے راستہ کھل جائے"!

اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک روپے کی ذخیرہ اندوزی کا تعلق ہے کلاسیکل اسکول کے مصنف اس امکان کو ہی نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کے خیال میں زر کی قیمت کی ناپائداری اس بات کی ضامن ہے کہ لوگ روپے جلدی سے خرچ کر دیں گے۔ لیکن فرض کیجئے توقع یہ ہو کہ آگے چل کر زر کی قیمت میں اضافہ ہوگا تو ہو سکتا ہے لوگ کچھ روپے پس انداز کر کے محفوظ رکھ لیں؟ ایسی صورت میں قوت خرید کی کمی پیدا ہو جائے گی یا نہیں۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کی ان مصنفوں نے کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ذخیرہ اندوزی کے برے نتائج پر غور نہیں کیا۔ ان کا ایک بنیادی مفروضہ تھا کہ لوگ جو دولت پس انداز کریں گے وہ محض اس لئے کہ اس رقم کی مدد سے بجائے عام استعمال کی چیزوں کے مشینیں یا اس طرح کی دوسری چیزیں حاصل کر لیں۔ یہاں ہم اس سے بحث نہیں کرینگے کہ ان میں کون سی رائے صحیح تھی کیونکہ اس تمہید سے محض یہ بتانا مقصود تھا کہ اس بحث نے ہی نظریۂ آمد و خرچ کو جنم دیا۔ یہ پتہ لگانے کیلئے کہ قوت خرید کافی ہوتی ہے یا نہیں یہ ضروری ہو گیا کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ آمدنی کی نوعیت کیا ہے، کیونکر آمدنی ہوتی ہے، اور پھر اسے کیونکر کام میں لایا جاتا ہے۔ آمدنی اور مجموعی قومی پیداوار میں کیا رشتہ ہے، اور ان دونوں میں کیونکر تبدیلیاں ہو سکتی ہیں وغیرہ۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ نظریہ ہے کیا؟
لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی چند خصوصیتوں سے آگاہی حاصل کر لی جائے۔ موجودہ زمانے کی شاید سب سے نمایاں خصوصیت تخصیص کار ہے، ہم میں سے ہر شخص وہ کام کرتا ہے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ یا وہ سمجھتا ہے کہ وہ موزوں ہے۔ اس خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جو مختلف چیزیں بناتے ہیں وہ بیچنے کے لئے بناتے ہیں یا ایسا بہت کم صورتوں میں ہوتا ہے کہ جو کچھ تیار کیا جائے وہ خود اپنے استعمال کے کام میں لایا جائے۔ زراعت پیشہ لوگ اپنے کھانے بھر غلہ اپنی ہی پیداوار سے حاصل کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا پیشہ ہو جس میں کوئی چیز ذاتی استعمال کیلئے ہی بنائی جاتی ہو۔ اس لئے یہ فرض کرنا غلط نہیں ہوگا کہ سرمایہ دار ملکوں میں جو کچھ بھی تیار کیا جاتا ہے وہ بازار میں بکنے کی خاطر تیار کیا جاتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان ملکوں میں ذرائع پیداوار تھوڑے سے افراد کی ملکیت ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے پیداوار کے متعلق فیصلے کرنا کہ کیا چیز تیار کی جائے، کیا چیز نہیں، یہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ فیصلہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کسی چیز کے بنانے میں نفع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر رائفلیں بنانا زیادہ "نفع بخش" ہو اور روٹی میں کم نفع ہو تو روٹی کی ضرورت ہوتے ہوئے بھی اس کی پیداوار بند یا کم ہو سکتی ہے۔
ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر اب آیئے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ آمدنی کا تعین کیونکر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے "آمدنی" کے تصور کی وضاحت ہونی ضروری ہے۔

سے کا ایک جملہ بہت ہی مشہور ہوا ہے۔ "چیزوں کی رسد خود اپنی طلب کا سامان پیدا کر لیتی ہے" عام خیال یہ ہے کہ سے نے یہ بات بالکل ہی نظر انداز کر دی تھی کہ بچت بے کار جا سکتی ہے اور

کسی ملک کی کسی مخصوص مدت میں آمدنی معلوم کرنے کے لئے ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ یہ معلوم کریں کہ اس مدت میں یہاں کیا اور کتنا پیدا ہوا ہے اس کے سمجھنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو ہم یہ معلوم کریں کہ ان مختلف لوگوں، یا ذرائع پیداوار کے مالکوں کو کتنے روپے مجموعی پیداوار کی قیمت میں سے حصے کے طور پر ملے۔ اور پھر انہیں جوڑ لیا جائے۔ بعض لحاظ سے یہ زیادہ بہتر صورت ہے کہ یہ جوڑ لیا جائے کہ اس مدت میں کتنی قیمت کی چیزیں تیار ہوئیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دونوں صورتوں سے نتیجہ ایک ہی حاصل ہوتا ہے پہلی صورت میں ہم افراد کو جو حصہ ملتا ہے اُسے جوڑ لیتے ہیں، دوسری صورت میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کتنی دولت پیدا ہوئی اور یہی دولت بٹتی ہے تو افراد کو اُن کا حصہ ملتا ہے۔

ہم موجودہ حالات میں سوسائٹی کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک تو وہ طبقہ جسے (ENTREPRENUER) کہتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پیداوار کا کام شروع کرتا ہے اور اسکا انتظام کرتا ہے۔ اس کی آمدنی متعین نہیں ہوتی، اس کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ خرچ اور قیمت کا باہمی تناسب کیا ہے، اگر پیداوار پر صرف کم آیا اور بازار میں دام اچھے ملے تو نفع ہوگا، ورنہ نقصان۔ دوسرے طبقے میں

اور اس سلسلے میں سے کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں سے نے اس امکان کا ذکر کیا ہے کہ بچت اگر بے کار رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سے بے روزگاری پیدا ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ سے اور ان کی طرح دوسرے کلاسیکل مصنفین نے یہ فرض کر لیا تھا کہ یہ امکان بہت ہی بعید از قیاس ہے۔ اور اس لئے ان کی ساری بحث و گفتگوئیں ہوتی تھی گویا وہ اس سچائی کو تسلیم کرتے ہیں جس کا سے کے اس جملے میں اظہار ہوتا ہے

وہ سب لوگ شامل ہیں جو محنت کرکے، یا اپنی خدمات اس پہلے طبقے کے ہاتھ بیچ کر روزی کماتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ہی پیداوار کا کام کرتے ہیں یعنی اپنے آپ مالک ہوتے ہیں لیکن چونکہ ترقی یافتہ ملکوں میں نمایاں پہلے دو طبقے ہیں اس لئے اگر ہم بھی انہیں سامنے رکھیں تو سہولت ہوگی۔ افراد کی آمدنی اب دو طرح کی ہو سکتی ہے

(۱) اجرت یا معاوضہ جو انترپرینیور مزدوری، تنخواہ، سود وغیرہ کی حیثیت سے تقسیم کرے (۲) انترپرینیور کا نفع سوسائٹی میں افراد کی آمدنی کا بڑا حصہ پہلے ذریعہ سے آتا ہے۔ مزدوروں کی آمدنی کا ذریعہ اجرتیں، اور دوسرے ملازموں کی آمدنی کا ذریعہ تنخواہیں ہوتی ہیں، کچھ لوگ زمین یا مکان یا دکان کی قسم کی چیزیں کرائے پر اٹھاتے ہیں، انہیں کرائے سے آمدنی ہوتی ہے، اسی طرح قرض پر روپیہ دینے والوں کے لئے سود ذریعہ آمدنی ہوتا ہے۔ انترپرینیور جو مشینیں وغیرہ استعمال کرتے ہیں اُن کیلئے سال بسال ایک رقم علیحدہ رکھ دیتے ہیں تاکہ مشینیں ٹوٹیں پھوٹیں، یا پرانی ہو جائیں تو ان کے بدلنے کیلئے ایک رقم اکھٹا رہے یہی ان کے اخراجات کی ایک مد ہے جس سے کسی کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا رہا، اگر اس فنڈ میں سے کوئی رقم مشینوں کے پرزے یا نئی مشین وغیرہ خریدنے میں لگے تو ظاہر ہے اس سے پرانی یا نئی مشین بیچنے۔ یا بنانے والوں کو آمدنی ہوتی ہے! اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگر انترپرینیور پیداوار میں خواہ وہ عام استعمال کی چیزوں کی پیداوار ہو یا مشینوں وغیرہ (اشیائے اصل) کی اضافہ کریں تو سوسائٹی میں بہت سے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، اگر اس میں کمی ہو تو ان طبقوں کی آمدنی میں کمی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ان کے اخراجات زیادہ ہوں تو لوگوں کی

آمدنی زیادہ ہوگی اور اگر کم ہوں تو آمدنی میں بھی کمی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ایک کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہے، اگر سب کے اخراجات زیادہ ہوں تو آمدنی زیادہ ہوگی، کم ہوں تو آمدنی میں بھی کمی ہو جائے گی۔

انٹر پرینیور طبقے کو جو نفع ہوتا ہے اس سے وہ دو کام لے سکتے ہیں، یا تو اسے کاروبار میں لگا دیں، یا اپنے استعمال میں لگائیں۔ لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی استعمال نہ ہو تو گویا اتنی رقم چیزوں کی خریداری کے لئے اب سوسائٹی کے ہاتھ سے باہر نکل جائے گی، اور اس کے نتائج خراب ہو سکتے ہیں۔

آمدنی کا استعمال کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ حصّہ تو ہم میں سے ہر ایک اپنی عام ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اس حصّے کو ہم "خرچ" کا نام دے سکتے ہیں، کچھ حصّہ ہم آڑے وقتوں کے لئے بچا رکھتے ہیں" بچانے" کے اصطلاحی معنی سمجھنا ضروری ہے۔ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ "خرچ" نہ کیا جائے۔ آمدنی کا جو حصّہ "خرچ" نہ کیا جائے وہ گویا "بچا" لیا گیا ہے۔ اس "بچے" ہوئے حصّہ سے کیا کام لیا جائے گا اس سے ہمیں فی الحال کوئی بحث نہیں۔ "خرچ" نہ کرنا "بچانا" ہے،

اوپر ہم نے آمدنی کی وضاحت کرنے کے سلسلے میں کہا تھا کہ ہم یا تو یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ مجموعی پیداوار میں سے مختلف طبقوں یا افراد کو جو رقم ملے وہ اُن کی آمدنی ہے، یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کی آمدنی برابر ہے اس تمام پیداوار کی قیمت کے جو کسی خاص مدت میں ہوئی ہو۔ پیداوار کی قیمت کے اس تصور کو ہم دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ پیداوار کا کچھ حصہ تو ایسی چیزوں پر مشتمل ہوگا جو لوگ عام استعمال کے لئے حاصل کرنا چاہیں گے؛

(اور ہم نے اس کام کو "خرچ" کا نام دیا ہے) کچھ حصہ ایسی چیزوں کی پیداوار پر مشتمل ہوگا جن سے مستقبل میں مزید آمدنی کی توقع کی جا سکے جیسے مشینیں وغیرہ۔ اسے ہم سرمایہ کاری کا نام دے سکتے ہیں۔ اس اصطلاح کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ سرمایہ کاری کے معنی ہیں کسی مشین یا ایسی چیز کی خریداری جس سے آئندہ آمدنی کی توقع ہو۔ مثال کے طور پر اگر اس مہینے میں سو روپے کی قیمت کی مشینیں بنی ہوں اور پچاس کی قیمت کی مشین فروخت ہوئی ہو تو اس مدت میں سرمایہ کاری کی مقدار پچاس روپے ہوگی لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ مجموعی پیداوار کا ایک حصہ انٹر پرینیور خود اپنے ہاتھ میں روک لیں، اب اگر اس تناسب میں اضافہ ہو تو سرمایہ کاری کی مجموعی مقدار معلوم کرنے کے لئے اسے بھی شامل کرنا ہوگا۔ اگر اس میں کمی ہو تو سرمایہ کاری کی مجموعی مقدار میں سے اسے نکال لینا ہوگا۔ لیکن عملاً سرمایہ کاری کی مقدار میں کمی بیشی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بنی ہوئی مشینوں کی کم مقدار خریدی بیچی گئی یا زیادہ کیونکہ یہی اہم جزو ہے

پیداوار کے اس حصے کو الگ کر کے جو انٹر پرینیور خود اپنے ہاتھ میں روک لے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی متعین مدت میں سوسائٹی کی آمدنی اسی مدت میں لوگوں کے "خرچ" اور "سرمایہ کاری" کے برابر ہوگی۔ اگر الف سے ہم "آمدنی" مراد لیں، خ سے "خرچ" جس کا مطلب ہے عام استعمال کی چیزوں کی خریداری اور "س" سے سرمایہ کاری تو چونکہ کسی نہ کسی طرح کے خرچ سے ہی آمدنی وجود میں آتی ہے، اور ہمارے ہاتھ میں دو ہی طرح کوئی رقم آ سکتی ہے، یا تو لوگ عام استعمال کی چیزوں پر خرچ کریں یا مشینیں وغیرہ خریدیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ الف = خ + س۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر "خ" یا "س" میں تبدیلی ہو تو الف میں بھی

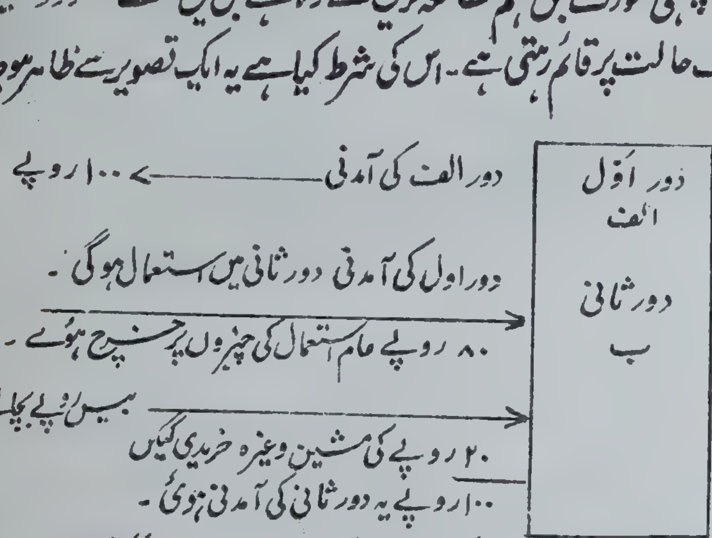
تبدیلی ہوگی، ان میں اضافہ ہو تو اضافہ، کمی ہو تو کمی۔

اب قبل اس کے کہ ہم اس سوال سے بحث کریں کہ آمدنی میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں، اور ان تبدیلیوں کے کیا نتائج ہوتے ہیں اوپر کی گفتگو کے نتائج دہرا لینا چاہئے تاکہ آتی بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ کسی مخصوص مدت کی آمدنی کا ذکر ہو تو اس کا اندازہ کرنے کیلئے اس مدت میں جو پیداوار ہوئی ہو اس کی قیمت کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ اس آمدنی کی تعریف دونوں طرح ہو سکتی ہے۔ یا تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس تمام قیمت کے مجموعے کا نام ہے جو ایک متعین مدت میں پیدا کی گئی ہے یعنی اشیاء صرف اور سرمایہ کاری کے کام کی چیزوں کی مجموعی قیمت — یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک کی آمدنی مجموعی پیداوار میں سے ان تمام کے حصوں پر مشتمل ہوتی ہے جنھوں نے اس کے وجود میں لانے میں مدد دی ہے۔ آمدنی کی مقدار کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ لوگ عام استعمال کی چیزوں اور مشینوں وغیرہ کی خرید کیلئے کتنی رقمیں خرچ کرتے ہیں۔ اسے ہم دوسرے الفاظ میں مجموعی طلب کا نام دے سکتے ہیں۔ اگر ان اخراجات یا مجموعی طلب میں اضافہ ہو تو آمدنی میں اضافہ ہوگا ورنہ کمی۔

اب ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ آمدنی میں تبدیلیاں کیونکر ہوتی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آمدنی کا استعمال کیونکر ہوتا ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم پروفیسر ہینڈلر کی کتاب سے مدد لیں گے۔ پروفیسر ہینڈلر نے آمدنی کے وجود میں آنے اور اس کے استعمال کے کا موقع سمجھنے کیلئے وقت کو "آمدنی کے دور" کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں آمدنی کے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ جو آمدنی ایک دور میں حاصل کی جاتی ہے وہ دوسرے

دور میں ہی خرچ ہو سکتی ہے یا بچائی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر الف دور میں تھوڑی ہی آمدنی ہو تو وہ ب دور میں استعمال ہوگی چاہے "خرچ" کی جائے یا بچائی جائے۔ اس تصور کی مدد سے تین حالتوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ (۱) وہ دور جس میں آمدنی یکساں رہتی ہے۔ (۲) وہ ایسے دور جب آمدنی میں کمی ہوتی ہے، (۳) وہ دور جب آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر صورت میں ہم فرض یہ کریں گے کہ پہلے دور میں آمدنی سو روپیہ ہوتی ہے۔ آمدنی کے وجود میں آنے اور صرف ہونے کو اس طرح دو حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ تو ایک مسلسل کام ہے۔ ہم آج جو کچھ کماتے ہیں آج ہی خرچ کر سکتے ہیں، لیکن جیسا کہ پروفیسر جیپنیڈ لر نے کہا ہے آمدنی میں تبدیلی کے مسئلے کا مطالعہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس سے ہم اصلیت سے کچھ دور نہیں ہوتے۔

پہلی صورت جس کا ہم مطالعہ کریں گے وہ ہے جس میں مختلف "دور" میں آمدنی ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔ اس کی شرط کیا ہے یہ ایک تصویر سے ظاہر ہو جائے گا۔



اب آیئے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ تصویر سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ دور اول کی

آمدنی جب لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ اسے کام میں لانا چاہیں گے۔ عام حالات میں آمدنی کا زیادہ بڑا حصّہ عام استعمال کی چیزوں کی خرید میں صرف ہوتا ہے جسے ہم نے اوپر "خرچ" کا نام دیا ہے۔ کچھ حصّہ لوگ بچا لیتے ہیں۔ اب اگر یہ حصّہ کسی کام میں نہ لایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اتنی رقم سے پیداوار کا جو ایک حصہ خریدا جا سکتا تھا اب بک نہیں سکے گا۔ اگر اس صرف میں کمی ہوئی تو آمدنی میں کمی لازمی ہوگی۔ کیونکہ ہم اوپر آمدنی کی تعریف کرتے وقت دیکھ چکے ہیں کہ آمدنی نام ہے سوسائٹی کے دو طرح کے صرف کا۔ آمدنی کا کوئی اور تصوّر ممکن ہے ہی نہیں۔ ایک کی آمدنی دوسرے کے خرچ کا نتیجہ ہوتی ہے، اور خرچ دو ہی طرح کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مثال میں ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ بیس روپے جو بچائے جاتے ہیں اُن سے مشینیں وغیرہ خریدنے کا کام لیا جاتا ہے یہاں یہ ذہن میں رکھ لینا چاہیئے کہ بچت کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے مشینیں خریدنے کا کام لیا جائے گا۔ سوسائٹی میں دو طرح کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو وہ جنھیں عام استعمال کی چیزیں کہہ سکتے ہیں، اُن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی افادیت کی مدت مختصر ہوتی ہے۔ ہم کھانا کھا لیتے ہیں تو اس کھانے کی اہمیت اور وجود دونوں ہی ختم ہو جاتے ہیں دوسری قسم اُن چیزوں کی ہے جن کی قیمت عرصے تک قائم رہتی ہے مشینیں، مکانات وغیرہ۔ مثلاً اگر کسی برس آپ ایک ہزار بچائیں، اور اُس سے ایک چھوٹی سی دکان بنوا لیں، تو آپ نے اس بچت سے ایک ایسی چیز بنوائی ہے جس کی قیمت کچھ مدت تک قائم رہے گی۔ لیکن بچت کے استعمال کا یہی طریقہ نہیں ہے۔ آپ اس سے یہ بھی کام لے سکتے تھے کہ کسی کمپنی میں ایک حصہ خرید لیں، کسی کو قرض دیدیں یا اس رقم کو نقد اپنی الماری میں رکھ چھوڑیں۔ زر کی کاموں کی وضاحت کرتے وقت

ہم نے کہا تھا اس سے ایک کام تو یہ لیا جاتا ہے کہ چیزوں کی لین دین مبادلہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ ایک اور کام یہ لیا جا سکتا ہے کہ اس شکل میں دولت محفوظ رکھی جائے۔ جہاں تک عام استعمال کی چیزوں اور زر کا تعلق ہے زر کا کام محض ذریعۂ مبادلہ کی حیثیت سے اہم ہے بچت کے معاملے میں زر کی حیثیت دولت جمع کرنے کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے اہم ہے۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی آدمی یہ طے کرتا ہے کہ کچھ رقم پس انداز کر لے تو ایک عجیب قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے زر کا استعمال نہ ہوتا تو بچت کا طریقہ یہی ہوتا کہ آپ کچھ عام استعمال کی چیزیں جو اس وقت پیدا کی جا رہی ہوں حاصل کر کے انہیں محفوظ کر لیجیے لیکن عام استعمال کی چیزوں کا جمع کرنا بے فائدہ ہوگا، کیونکہ وہ زیادہ دنوں تک رکھی نہیں جا سکتیں۔ زر کے استعمال کی وجہ سے اب یہ ممکن ہو گیا کہ آپ چیزوں کے بدلے میں زر جمع کر لیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ زر سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ وہ عام استعمال کی چیزوں کو آپ کے لیے محفوظ کر دے جو ناممکن سی بات ہے۔ فرض کیجیے ایک سوسائٹی میں محض عام استعمال کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اب اس میں زید صاحب یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کسی سال سو روپے اور اسے نقد کی شکل میں چھپا کر رکھ لیتا ہے۔ اس چھپی ہوئی دولت کو اگر وہ آنے والے سال میں نکال لیں تو اس کی مدد سے وہ اس رقم کے علاوہ جو اس سال

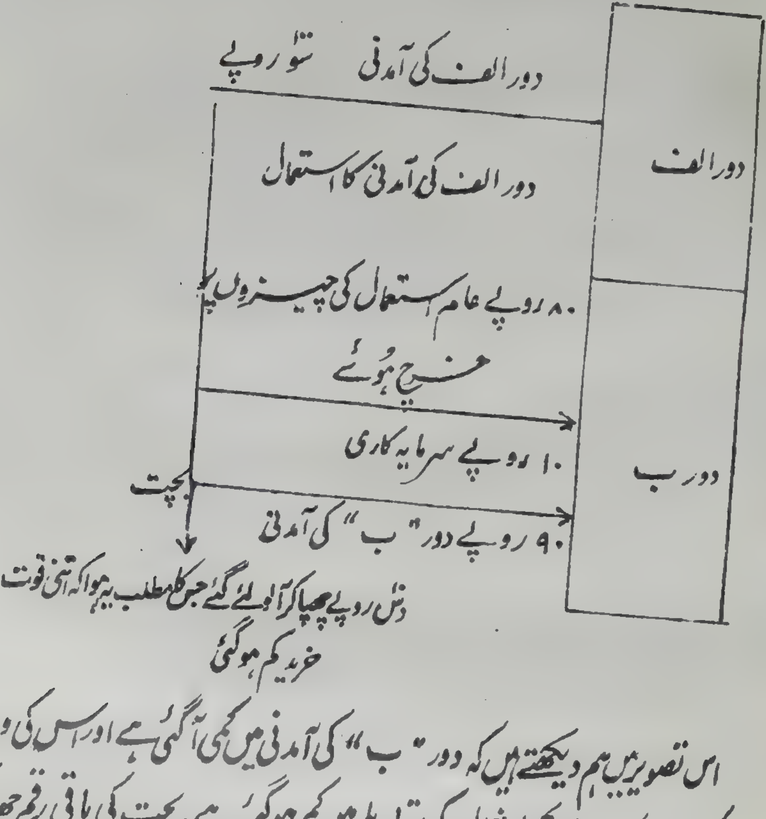
اس گفتگو میں خرچ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو وہ معنی جو عام بات چیت میں ہم سمجھتے ہیں۔ ایک اصطلاحی معنی میں جس سے مراد آمدنی کے اس حصہ کے استعمال کی طرف اشارہ ہے جو عام استعمال کی چیزوں کے خریدنے کے کام میں لائی جائے۔ جہاں خرچ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے اسے واوین میں رکھ دیا گیا ہے تاکہ فرق واضح رہے۔

کمائے اس سَو روپے کی بھی چیزیں خرید سکتا ہے۔ لیکن اس عرصے میں چونکہ اس سوسائٹی کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا (حقیقتاً کمی ہو جائے گی) اس لئے اب چیزوں کی خریداری کے لئے دو سَو روپے ہو گئے، چیزیں سَو ہی روپے کی رہیں۔ اگر پیداوار اپنی پچھلی سطح پر قائم بھی رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ چیزوں کے دام بڑھ جائیں گے۔ یہ ضرور ہوگا کہ چونکہ اور کسی نے کوئی رقم چھپا چھپا کر نہیں رکھی ہے اس لئے زید کو اپنی چھپائی دولت کی مدد سے زیادہ چیزیں حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا اور لوگ کم چیزیں پا سکیں گے۔ لیکن ہماری موجودہ زندگی میں یہ نہیں ہوتا کہ محض عام استعمال کی چیزیں ہی پیدا ہوں۔ بلکہ بعض ایسی چیزیں بھی بنتی ہیں جن کی قیمت مدتوں تک باقی رہتی ہے۔ مثلاً جس برس زید نے سَو روپے جمع کئے ہیں ہو سکتا ہے اسی برس بکر سَو روپے کی قیمت کی کوئی مشین بناتا ہے۔ اب اس سوسائٹی کی حقیقی دولت بڑھ گئی ہے۔ اگلے برس زید اپنے سَو روپے خرچ کرنا چاہے تو اس سوسائٹی میں بکنے کے لئے سَو روپے کی یہ مشین ہوگی، اور اس برس کی پوری پیداوار اس طرح روپے بچا کر رکھنا سوسائٹی کے لئے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر یہ ہو کہ جتنی دولت بچائی جائے اسی کے تناسب سے پائدار چیزیں بنائی جائیں تو سوسائٹی کے پاس ایسا ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنا معیار زندگی آنے والے زمانے میں بہتر بنا سکتی ہے۔ اوپر کی پہلی مثال میں کوئی شخص بیس روپے بچاتا ہے، کوئی اور بیس روپے کی مشین خریدتا ہے۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری برابر رہتے ہیں، مجموعی خرچ سَو روپے رہتا ہے اور سوسائٹی کی آمدنی دور اول کی ہی سطح پر قائم رہتی ہے۔ لیکن یہ بات پھر دہرانے کی ہے کہ سرمایہ کاری سے مراد یہ ہے کہ

تیار مشین وغیرہ خریدی جائیں، تجارتی دستاویزیں، پُرانا مال خریدنا یا کسی کو قرض دینا یہ سرمایہ کاری کے تحت نہیں آتا، اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح رقم منتقل ہو کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پہونچ جائے جو مشین خریدنا چاہتے ہوں۔

اوپر کی مثال سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آمدنی اس وقت تک ہی اپنے پچھلے دور کی سطح پر قائم رہ سکتی ہے جب تک بچت اور سرمایہ کاری برابر رہیں۔ اور اس شرط کے پورا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی رقم چھپا کر نہ رکھی جاتی اور اس طرح زر کی مقدار میں (یا قوت خرید) کمی نہ ہونے پائے۔ یا پھر اگر ان دونوں میں تبدیلیاں ہوں تو ایسی کہ ایک دوسرے کی تلافی ہو جائے۔ جب تک یہ صورت باقی رہے گی آمدنی ایک سطح پر قائم رہے گی اگر دوسرے دور میں عام استعمال و سرمایے کی چیزوں (مشینوں وغیرہ) کی پیداوار (۱۰۰) ہو تو اُن کی اوسط قیمت ایک روپیہ فی چیز ہوگی، اور جب تک پیداوار اسی سطح پر ہوگی یہی قیمتیں باقی رہیں گی۔ یہ قیمت ایسی ہوگی کہ اس سے نہ صرف پیداوار کے اخراجات پورے ہو جائیں گے بلکہ انترپرینیور کے لئے کچھ منافع بھی بچ رہے گا اس لئے وہ پیداوار کو اس سطح پر قائم رکھنا چاہیں گے لیکن اگر پیداوار سنو سے زیادہ ہو جائے اور مجموعی خرچ سنو ہی رہے تو قیمتوں کا گرنا ضروری ہوگا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قیمتوں کی کمی بے روزگاری کا پیش خیمہ ثابت ہو، اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ مصارف پیداوار پر کیا اثر پڑیگا اور اس لئے انترپرینیور کے نفع کی کیا حالت ہوگی۔ اگر فرض کیجئے یہ کمی کسی نئی ایجاد کا نتیجہ ہے جس کی بدولت چیزوں کا بنانا آسان ہوگیا ہے تو قیمتوں میں کمی نقصان کا باعث نہیں ہوگی اور بیروزگاری کا اندیشہ نہیں پیدا ہوگا۔

اب آئیے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ آمدنی میں کمی کی صورت میں ہماری پچھلی تصویر پر کیا اثر پڑے گا۔ پہلے کی طرح دور اول کی آمدنی اب بھی سو روپے ہے



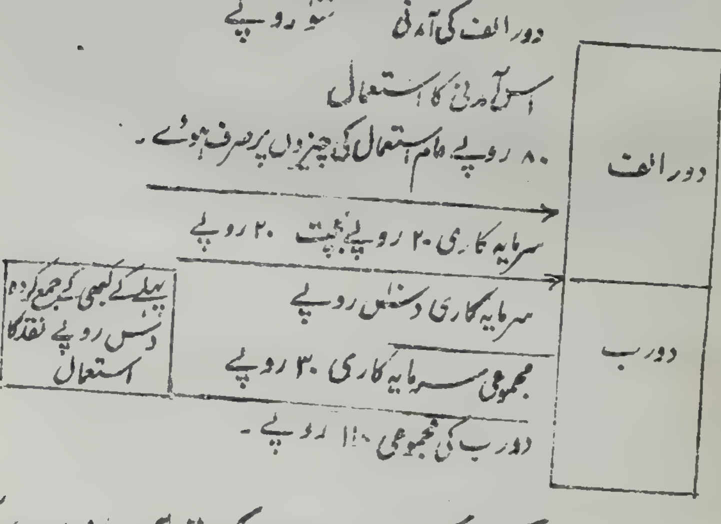
اس تصویر میں ہم دیکھتے ہیں کہ دور "ب" کی آمدنی میں کمی آگئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ کاری میں پچھلی مثال کے مقابلے میں کمی ہو گئی ہے۔ بچت کی باقی رقم چھپا کر رکھ لی گئی ہے (HOARD) کوئی رقم چھپا کر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی رقم نقد کی صورت میں ہاتھ میں رکھ لی جائے اور خرچ ہو کر آمدنی نہ بن سکے۔

اس تصویر میں جب دور الف کی آمدنی استعمال کے لئے لوگوں کے ہاتھ دور ب میں پہونچ جاتی ہے تو وہ (۸۰) روپے عام استعمال پر خرچ کرتے ہیں۔ باقی بیس روپے بچتے ہیں، اس میں سے دس روپے کی تو وہ ملمنینیں وغیرہ خریدتے ہیں۔ لیکن باقی

دس روپے نقد اکٹھا کر چھوڑتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی پیداوار جس کی قیمت سو روپے تھی یا تو پوری بک نہیں سکے گی، یا بکے گی تو کم داموں پر جن میں انٹرپرینیور کو نفع نہیں ہوگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار میں کمی ہوتی جائے گی، اور چونکہ پیداوار کی قیمت ہی سے آمدنی بنتی ہے آمدنی میں کمی ہونے لگے گی۔ یہاں اس سوال پر غور کرنا مناسب ہوگا کہ بچت کی رقم سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں، یا یہ کہ بچت کیونکر ضائع ہو سکتی ہے۔ اگر اسے سرمایہ کاری کے کام میں نہ لگایا جائے۔ اور یہ بالکل ضروری نہیں — تو اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کی مدد سے زر کی مقدار میں کمی کی جائے، ایسا ہو تو گویا اتنی قوت خرید برباد ہو گئی۔ ایسا یوں ممکن ہے کہ اگر بینک سے قرض لینے والے قرض واپس کریں تو ممکن ہے کہ بینکر اپنے پیدا کردہ مجموعی زر بینک کی مقدار میں کمی ہو جانے دیں۔ حکومت یا دوسرے ادارے اگر بچت کو بینکوں کے پیدا کردہ زر کی مقدار میں کمی کے لیے استعمال کریں تو بھی یہ نتائج برآمد ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی بہت سی صورتیں ممکن ہیں جن پر عمل ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بچت سرمایہ کاری کے بجائے ایسے کاموں کے لیے استعمال ہو سکتی ہے جن سے آمدنی میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ اب اگر ایسا ہو کہ بچت کی مقدار سرمایہ کاری سے زیادہ ہو تو آمدنی میں کمی ہوگی۔ ایک ایسے معاشی نظام کے لئے جس میں چیزیں بکنے کے لئے ہی پیدا کی جاتی ہوں۔ یہ صورت تباہ کن ہوگی۔ حقیقی پیداوار، یا حقیقی آمدنی کی مقدار میں تو زیادہ کمی نہیں ہوتی کیونکہ ایک حد تک یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں کم کر کے

پیداوار پچھلی سطح پر ہی قائم رکھی جاتی ہے لیکن نقد آمدنی میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔
لیکن ہمارے نظام کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں نقد صرف میں کمی مشکل سے ہوتی ہے
پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض کاروبار میں مالک قیمتوں میں کمی کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں
ہوتے، ان وجہوں سے اگر طلب میں کمی ہو جائے تو اس کے پیداوار کی مقدار،
روزگار اور قومی آمدنی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کلاسیکل اسکول کے ماہر اس
امکان کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور یہی اُن کی غلطی تھی۔

اب ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ آمدنی میں اضافہ کیونکر ممکن ہوگا؟ اس تیسری
تصویر سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا پہلے کی طرح دور الف کی آمدنی
اب بھی (۱۰۰) روپے ہی ہے۔



اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ دور الف میں بچت کی مقدار بیس روپے ہے، لیکن
دور ب میں جب اس سے کام لیا جاتا ہے تو پہلے کی بچی کی جمع شدہ رقم میں سے دس روپے
اور نکال لئے جاتے ہیں، اس طرح سرمایہ کاری کی مقدار تیس ہو جاتی ہے، حالانکہ دور الف

کی بچت محض بیس روپیہ ہی ہے، اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کاری بچت کے مقابلے میں زیادہ ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجموعی پیداوار کی قیمت ۱۱۰ روپے ہو جاتی ہے۔ گویا آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ اس صورت میں قیمتوں میں اضافہ ہوگا، اس لئے انٹرپرینیور کے منافع میں بھی اضافہ ہوگا، اس لئے آئندہ کے لئے آمدنی میں اضافے کے سامان ہو گئے۔ لیکن یہ جو دس روپے ہماری اس تصویر میں آ گئے ہیں یہ عملی زندگی میں کہاں سے آ سکتے ہیں؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ باہر سے زر درآمد ہو، یا مرکزی بینک زر کی مقدار میں اضافہ کر دے، زیادہ ممکن بات یہ ہے کہ بینک زر کی مقدار میں اضافہ کر دیں، زیادہ قرض دیکر، یا دستاویزیں خرید کردہ سوسائٹی کے ہاتھ میں زیادہ قوت خرید دے سکتے ہیں جو عام استعمال کی چیزوں یا (اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے) سرمایہ کاری کے لئے خرچ کر سکتے ہیں۔ ایک ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں نقد جو جمع ہو اس سے کام لینا شروع کر دیں، مختلف تجارتی اور مالی ادارے یہی کر سکتے ہیں۔ ان مختلف ذرائع سے یہ ممکن ہے کہ کسی دور میں سرمایہ کاری اس دور کی بچت کے حساب سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں یہ ہوگا کہ انٹرپرینیور کے ہاتھ میں منافع کی حیثیت سے زیادہ رقم آئے گی، جیسے کہ اس سے پہلی والی مثال میں سے نقصان ہوا تھا۔ پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ انٹرپرینیور کی اپنی آمدنی اس صورت میں بڑھے گی، جیسے کہ پچھلی مثال میں گھٹی تھی، اور اس وجہ سے ایسے رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں کہ آمدنی میں مزید اضافے یا کمی ہو۔

ایسا کیوں ضروری ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری کی مقدار مساوی ہو اس سوال کا

جواب اوپر کی گفتگو میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس پر تھوڑا سا اور وقت صرف کرنا ضروری ہے۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ آمدنی نام ہے اخراجات کا، دوسرے الفاظ میں اخراجات سے آمدنی بنتی ہے، ان اخراجات کی نوعیت دو طرح کی ہوتی ہے، عام استعمال کی چیزوں پر خرچ، اور سرمایہ کاری پر خرچ، ایک مثال سے آیئے اب یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آمدنی کی مقدار کیوں بچت اور سرمایہ کاری کے مساوی ہونے پر مبنی ہوتی ہو، بلکہ یوں کہئے کہ آمدنی کی سطح میں استحکام کے لئے یہ کیوں ضروری ہے، کہ بچت اور سرمایہ کاری برابر ہوں۔ ذیل کی مثال پروفیسر سیموئلسن کی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس نقشے میں دو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں، ان الفاظ سے ہم نے پہلے کام لیا ہے لیکن یہ اصطلاحی نام ابھی تک استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مختصراً ان کی توضیح کر دی جائے۔ "رجحان صرف" سے مراد یہ ہے کہ کسی متعین آمدنی کا کتنا حصہ لوگ عام استعمال کی چیزوں پر خرچ کریں گے۔ "رجحان بچت" سے مراد یہ ہے کہ آمدنی کی کتنی رقم لوگ بچاتے ہیں۔ ہم اب تک ان کے لئے "خرچ" اور "بچت" کا استعمال کرتے رہے ہیں۔

(۱) قومی آمدنی مقدار	(۲) رجحان صرف	(۳) = ۱-۲ رجحان بچت	(۴) مقدار سرمایہ کاری کی مفروضہ	(۵) = ۱ مختلف کاروبار میں کتنی رقم ادا کی جائے گی۔	(۶) اس ادا شدہ رقم کا کتنا حصہ پھر "خرچ" اور "سرمایہ کاری" کے ذریعہ کاروباری لوگوں کے ہاتھ میں واپس پہونچے گا۔	(۷) آمدنی پر کیا اثر ہوگا۔
الف ۲۳۰	۲۰۰	۳۰	۱۰	۲۳۰	۲۱۰ جو ۲۳۰ سے کم ہے	کمی ہوگی
ب ۲۰۰	۱۸۰	۲۰	۱۰	۲۱۰	۱۹۰ جو ۲۱۰ سے کم ہے	" "
ج ۱۷۰	۱۶۰	۱۰	۱۰	۱۷۰	۱۷۰ کاروباری لوگ جتنا ادا کرتے ہیں اتنا ہی انھیں واپس ملتا ہے۔	اس سطح پر پہونچ کر آمدنی میں تبدیلی کا رجحان نہیں رہے گا۔
د ۱۴۰	۱۴۰	صفر	۱۰	۱۴۰	۱۵۰ جو ۱۴۰ سے زیادہ ہے	آمدنی بڑھے گی
ذ ۱۱۰	۱۲۰	۱۰	۱۰	۱۱۰	۱۴۰ جو ۱۱۰ سے زیادہ ہے	آمدنی بڑھے گی

اس نقشے میں پہلے کالم میں آمدنی کی مختلف سطحیں فرض کی گئی ہیں، دوسرے کالم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان مختلف حالتوں میں لوگ کتنا عام استعمال کی چیزوں پر خرچ کریں گے۔ تیسرے کالم سے رجحانِ بچت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی فرضی ہے۔ چوتھے کالم میں محض سہولتوں کی خاطر یہ دکھایا گیا ہے کہ سرمایہ کاری کی سطح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ مفروضہ صحیح نہیں، اس لئے کہ سب سے زیادہ تغیر پذیر جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے یہی عنصر ہے، لیکن اس مفروضے سے مقصد محض یہ ہے کہ مسئلے کی نوعیت واضح ہو جائے اور اس کے لئے یہ بہت مفید ہے۔ پانچواں کالم پہلے کالم کا دوسرا نام ہے، ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ قومی آمدنی ان مختلف معاوضوں کے مجموعے کا نام ہے جو مختلف عناصر پیداوار کو مجموعی پیداوار میں شرکت کے بدلے ملتا ہے، مزدور کو اجرت، مکان یا زمین کرائے پر دینے والوں کو کرایہ، خام اشیاء مہیا کرنے والوں کو ان کے دام، تاجروں وغیرہ کو ان کی محنت کا معاوضہ، کمیشن، و منافع یا اس طرح کی اور صورتوں میں۔ دوسرے الفاظ میں آمدنی، اور وہ رقم جو مختلف "کاروبار" کے مالک مختلف صورتوں میں ادا کرتے ہیں۔ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اس لئے پہلا اور پانچواں کالم دونوں ایک ہی تصور کو ظاہر کرتے ہیں، چھٹے کالم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب لوگوں کے ہاتھ میں آمدنی کی ایک متعین رقم آجاتی ہے تو وہ اس میں سے کتنا "خرچ" اور سرمایہ کاری یا مشینوں وغیرہ کی خرید کے سلسلے میں کاروباری لوگوں کو واپس کر دیتے ہیں۔ چھٹا کالم دوسرے اور چوتھے کالم کے مجموعے کو ایک جگہ دکھا دیتا ہے۔

اس نقشے میں خاص طور پر توجہ پانچویں اور چھٹے کالم کو دینی چاہیے۔
ظاہر ہے "کاروباری" لوگ، (اس سلسلے میں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہاں کاروباری لوگوں سے مراد وہ تمام لوگ، یا جماعتیں، یا ادارے ہیں جو پیداوار کا کام کسی بھی صورت میں انجام دیتے ہیں) کوئی چیز پیدا کرتے ہیں تو اس توقع میں کہ اسے فروخت کر کے کچھ نفع کمائیں گے۔ اب اوپر کے نقشے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب یہ لوگ مختلف خدمات یا چیزوں کے معاوضے میں (۲۳۰ روپے یا ڈالر یا جو چاہے سمجھ لیجیے) کی رقم ادا کرتے ہیں، تو لوگوں کے ہاتھ میں آمدنی تو ۲۳۰ کی آتی ہے، لیکن وہ اس آمدنی سے محض ۲۱۰ کی چیزیں خریدتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروباری لوگ جتنی رقم ادا کرتے ہیں اس سے کم واپس پاتے ہیں، دوسرے الفاظ میں وہ جو رقم اجرت، کرایہ سود اور منافع کی شکل میں ادا کر دیتے ہیں اس سے کم پاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی آمدنی مصارف پیداوار سے کم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں انھیں منافع کے بجائے نقصان ہوگا، اور وہ اپنے کاروبار کو یقیناً گھٹانا چاہیں گے، چنانچہ وہ دوسرے دور میں اپنی پیداوار میں کمی کرتے ہیں، لیکن اب بھی انہیں جتنی رقم ادا کرنی پڑتی ہے اس سے انہیں کم واپس ملتی ہے، نقصان اب بھی ہوگا، اس لیئے پیداوار اب بھی زیادہ ہے چنانچہ تیسرے دور میں وہ اپنا کاروبار اور بھی کم کرتے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مصارف پیداوار (جن میں کاروباری لوگوں کے لیئے ایک "مناسب" نفع بھی شامل ہے) اور وہ رقم جو ان کی پیداوار کی قیمت کے عوض انہیں لوٹائی

جاتی ہے وہ دونوں برابر ہیں۔ اب آئیے نقشے میں آخری دو حالتوں کو لیں، جب آمدنی ۱۱۰ اور ۱۴۰ ہے۔ ان دونوں صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کاروباری لوگ جو رقم صرف کرتے ہیں وہ کم ہے، لوگ جتنی چیزیں خریدتے ہیں اُن کی رقم زیادہ، گویا یہ صورتیں نفع کی ہیں۔ چنانچہ پیداوار میں، اور اس لئے آمدنی میں اضافے ناگزیر ہیں، اضافہ آمدنی ۱۷۰ پر پہونچ کر ختم ہوجائے گا کیونکہ اس کے آگے نقصان کی حد شروع ہوجاتی ہے، اس سے کم پر نہیں رکے گا۔ کیوں ابھی فائدے کا امکان باقی ہے۔

اب آئیے تیسرے اور چوتھے کالم پر نظر ڈالیں۔ جب "رجحان بچت" یا سادے لفظوں میں وہ رقم جو لوگ بچانا چاہتے ہیں ۳۰ ہے تو "سرمایہ کاری" کی مقدار یا مشینوں کی خرید کی رقم ۱۰ ہے۔ یعنی بچت کی مقدار سرمایہ کاری سے زیادہ ہے، تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آمدنی کم ہوتی ہے، اور اگلے دور میں اس کمی کے نتیجے کے طور پر بچت میں بھی کمی ہوتی ہے، گویا سرمایہ کاری اگر بچت سے کم ہو تو اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے خود بچت کو گرنا ہوتا ہے، اور بچت میں کمی اس طرح آتی ہے کہ سرمایہ کاری میں کمی کی وجہ سے آمدنی کم ہوتی ہے، اور اس لئے لوگ کم رقم بچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یا اس صلاحیت میں کمی آجاتی ہے، اسی طرح جب سرمایہ کاری بچت سے زیادہ ہوتی ہے تو آمدنی بڑھتی ہے، اور اس لئے بچت کی صلاحیت بڑھتی ہے، ان دونوں میں جہاں توازن پیدا ہوجاتا ہے وہیں آمدنی کا بڑھنا اور گھٹنا بند ہوجاتا ہے۔

نظریۂ آمدنی و خرچ کی موٹی موٹی باتیں ہوچکیں۔ اس نظریہ کی مدد سے تجارتی

مدوجزر کے مسئلے پر کیا روشنی پڑتی ہے، یا اس نظریے کو نظریہ مقدار پر کیونکر برتری حاصل ہے۔ ہم ان سوالات سے اگلے صفحات میں بحث کریں گے۔ لیکن پہلے اس نظریے کے سلسلے کی ایک بات جاننا ضروری ہے۔ اب تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ آمدنی میں تبدیلیوں کا انحصار بچت اور سرمایہ کاری کے باہمی تعلق پر ہے۔ پچھلی عالم گیر کساد بازاری کے دوران میں مختلف حکومتوں نے اپنے مصارف میں اضافے کے ذریعے کساد بازاری کا علاج کرنے کی کوشش کی تھی، اس بحث میں ایک نئے تصور نے جنم لیا۔ اسے انگریزی میں (MULTIPLIER*) کہتے ہیں کینس نے پہلے پہل اس تصور کی طرف توجہ دلائی اس کے بعد سے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن ہمیں تو اسکے متعلق موٹی موٹی باتیں ہی جاننی ہیں۔ کینس اور اس کے ہم نوا ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ اگر بچت اور سرمایہ کاری کے درمیان کوئی فرق پیدا ہو جائے تو نتیجہ یہی نہیں ہو گا کہ آمدنی کم یا زیادہ ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آمدنی میں یہ کمی یا زیادتی اس فرق کے کئی گُنے کے برابر ہو گی اگر یہ ہو کہ سرمایہ کاری بچت کے مقابلہ میں زیادہ ہو تو تھوڑے سے وقت کے گزر جانے کے بعد نتیجہ یہ ہو گا کہ آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو جائیگا۔ اور اگر بچت سرمایہ کاری کے مقابلے میں زیادہ ہو تو آمدنی میں اسی طرح کئی گُنا کمی ہوگی۔ آمدنی میں کتنی کمی یا زیادتی ہوتی ہے اسے "ملٹیپلایر" کہتے ہیں، اس خاص اثر کو ملٹیپلایر اثر۔ فرض کیجئے کہ سرمایہ کاری میں اگر ۵ کا اضافہ ہو اور آمدنی بڑھ کر

* اس اصطلاح کے لیے کوئی اُردو کا لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وجہ یہ ہو کہ اس لفظ کی آواز مجھے پسند ہے۔

۱۵ ہو جائے تو یہ کہیں گے کہ ملٹیپلائر ۳ ہے۔

یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے کہ ملٹیپلائر کیوں ایک سے زیادہ ہوگا۔ فرض کیجیے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ دس ہزار میں ایک مکان بنواؤں۔ میں کچھ مزدور کام پر لگاؤں گا، کچھ سامان خریدوں گا۔ اس خرید کا ظاہر ہے یہ نتیجہ ہوگا کہ ان مختلف لوگوں کے ہاتھ میں جو میرا مکان بنانے میں مدد دے رہے ہیں کچھ آمدنی آئے گی۔ یہ لوگ مل کر دس ہزار کمائیں گے، لیکن یہاں قصہ ختم نہیں ہوتا۔ فرض کیجیے یہ سب لوگ اس جماعت میں ہیں جس کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور اس لیے اس کا رجحان صرف بہت زیادہ ہوتا ہے یعنی ان کی آمدنی چونکہ بہت ناکافی ہوتی ہے اس لیے وہ اس میں سے بہت تھوڑا حصہ بچا سکتے ہیں۔ فرض کیجیے میرا مکان بنانے کے کام میں حصہ لینے والے جو کچھ کمائیں اس کا $\frac{1}{2}$ عام استعمال کی چیزوں پر صرف کر دیں گے۔ اب اگر ان کے ہاتھ میں مجموعی طور پر دس ہزار کی رقم آئے تو وہ اس کا $\frac{2}{3}$ عام استعمال کی مزید چیزوں کے خریدنے پر صرف کریں گے ان چیزوں کے بنانے والوں کو جن کی مانگ اس طرح بڑھ گئی ہے اب مزید آمدنی ہوگی، اگر اسی طرح وہ بھی اپنی بڑھی ہوئی آمدنی کا بڑا حصہ مزید چیزوں کے خریدنے پر صرف کر دیں تو کچھ اور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہے گا۔ اگر آمدنی پر اور کوئی اثرات نہ پڑ رہے ہوں، یا ہم انھیں الگ کر سکیں تو ان مفروضوں کے بعد آمدنی میں تین گنا اضافہ ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ہر قدم پر "خرچ" $\frac{2}{3}$ سے کم ہو۔ اور کچھ حصہ بچت میں کھپتا رہے تو ملٹیپلائر کم ہو جائے گا۔ پچھلے صفحات میں ہم نے بچت اور سرمایہ کاری کے

ذریعہ آمدنی کے تعین کے متعلق جو نقشہ دیا ہے اُس سے بھی ہمیں ملٹی پلایر کے سمجھنے میں تھوڑی سی مدد مل سکتی ہے۔ فرض کیجیے کسی وجہ سے سرمایہ کاری کی مقدار میں دس کا اضافہ ہو جائے۔ اب دیکھئے آمدنی فوراً بڑھ کر ۲۰۰ ہو جائے گی، اور بچت میں بھی دس کا اضافہ ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں سرمایہ کاری کے اضافے سے ایسے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ بچت میں اضافہ ہو جائے اور بچت اور سرمایہ کاری میں توازن ایک دوسری تعداد پر ہو۔ اس کی شرط یہ ہے کہ آمدنی کا بڑا حصہ "خرچ" کیا جائے، "خرچ" کا تناسب زیادہ ہوگا تو ملٹی پلایر پر بھی اثر زیادہ ہوگا لیکن اگر ہر قدم پر بچت میں کوئی قابل لحاظ رقم کھپ جائے تو یہ اثر کم ہوتا جائے گا، اور ملٹی پلایر چھوٹا۔

اب بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نظریہ آمدنی و خرچ مکمل طور پر ہم نے پیش کر دیا۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ کل خرچ افراد، یا ایسے ادارے کرتے ہیں جنکی بنیاد نفع کی خواہش پر رکھی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آمدنی اور خرچ پر مالیات عامہ کے اثرات سے بحث نہیں کی۔ اگر حکومت لوگوں پر ٹیکس لگائے تو لازماً اس قسم میں جو لوگ اپنے فیصلے اور اپنی خواہش کے مطابق خرچ کر سکتے ہیں کمی ہو جائے گی، اس سے بچت اور "خرچ" دونوں ہی پر اثر پڑے گا، یہ اثر اچھا ہوگا یا بُرا، یہ سب مسائل بہت ہی جھگڑے کے مسائل ہیں اور ان کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمارا مقصد نظریہ آمد و خرچ کی بنیادی باتیں سمجھنا ہے، اور ان کے سمجھنے کے لئے اگر ہم حکومت کے محصولوں، اور حکومت کے اخراجات کو بھی خرچ اور سرمایہ کاری کے ضمن میں سمجھ لیں، تو ہمارا کام چل جائے گا۔ حکومت جو روپے لیتی ہے وہ بچت

خرچ کرتی ہے، اب اگر حکومت کا "خرچ" اور عوام کا "خرچ" اور حکومت کی سرمایہ کاری، نیز غیر سرکاری سرمایہ داری مل کر اتنی مجموعی رقم مہیا کر دیں کہ روزگار کی حالت اچھی ہو تو یہ اچھی رہے گی، آمدنی کے استحکام کی شرط اب بھی وہی ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری برابر ہوں، حکومت ان دونوں پر کیا اثر ڈالتی ہے، ان سے آمدنی کی سطح پر ویسا اثر پڑے گا۔

پروفیسر سیموئلسن کے بہ قول بچت اور سرمایہ کاری کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہماری موجودہ سرمایہ دار سماج میں یہ دونوں کام الگ الگ لوگ انجام دیتے ہیں، ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بچت یا روپے پس انداز کرنے سے اگر سماج میں محض عام استعمال کی ہی چیزیں پیدا ہوتی ہوں، تو کتنی خطرناک صورت پیدا ہو جاتی ہے مشینوں یا پائدار چیزوں کی پیداوار کی بدولت یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ افراد کفایت شعاری سے کام لیں تو ملک اور قوم کو نقصان نہ پہونچے بلکہ اس کی حقیقی دولت میں اضافے کی صورت پیدا ہو۔ اب اگر ایسا ہو جائے کہ ہر آدمی جو کچھ بچائے خود ہی اسے سرمایہ کاری میں لگا دے تو کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو، لیکن موجودہ سماج کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچت اور سرمایہ کاری ایک ہی ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ پرانے زمانہ میں کوئی کسان اگر اپنے کھیت کے قریب کنواں کھودنا چاہتا تو وہ اپنی آمدنی میں سے اس مقصد کے لیے کچھ رقم پس انداز کرتا، جب پیسے جمع ہو جاتے تو وہ کنواں کھود لیتا، نہ صرف یہ کہ بچت اور سرمایہ کاری دونوں ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں ہوتیں، بلکہ بچت کی ضرورت ہی اُسے اس لئے پیش آتی تھی کہ اس کے سامنے

اس بچت کو کسی بار آور کام میں لگانے کا امکان تھا، اگر یہ امکان نہ ہوتا تو وہ بچت کرنا ہی نہیں چاہتا، اور اگر کوشش کرتا تو ناکامیاب ہوتا۔

موجودہ معاشی نظام میں سرمایہ کاری کا کام بہت بڑی حد تک کاروباری ادارے، کمپنیاں، اور کارپوریشن کرتے ہیں، یہ فرمیں خود ایک حد تک رقمیں پس انداز کرتی ہیں، لیکن افراد بھی اپنی اپنی ضرورتوں، یا مصلحتوں کے پیش نظر کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے ہیں۔ مثلاً میں اور آپ بڑھاپے کے لیئے کچھ بچا رکھنا چاہتے ہیں، مستقبل میں جانے کیا ضرورتیں پڑ جائیں، بیماری، بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے، ان سب خطرات سے بچنے کے لئے ہم کچھ بچا کر رکھ سکتے ہیں، اس طرح اور بہت سے محرکات ایسے ہو سکتے ہیں جن کی بدولت افراد رقمیں پس انداز کر سکتے ہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ ان کا سرمایہ کاری سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہو، اور عملی زندگی میں ان کا کوئی باہمی تعلق ہوتا بھی نہیں، گو عام بول چال میں روپیہ لگانے (یا سرمایہ کاری) کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کوئی حصہ خرید لے، یا کسی کو قرض دیدے۔ یہ چیزیں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں "سرمایہ کاری" کے اصطلاحی معنوں میں شامل نہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ جب سرمایہ کاری کے امکانات نہ بھی ہوں تو مختلف لوگ کچھ پیسے بچا رکھیں۔

سرمایہ کاری کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ "سرمایہ کاری کے امکانات کا تعلق نئی ایجادات، نئی پیداواروں کی دریافت، نئے ملک یا نئے علاقوں کی دریافت، نئے ذرائع، نئی آبادی، آبادی میں اور آمدنی میں اضافوں پر ہے، نئی کوئی چیز ایجاد ہو تو اس کے

تیار کرنے کے لئے مشینوں کی ضرورت ہوگی ۔ ان چیزوں میں سرمایہ لگانے کے امکانات پیدا ہوں گے ، اس طرح سرمایہ کاری کا انحصار اس پر ہے کہ نئی ایجادات کی رفتار کیا ہے ، سیاست کا رخ کیا ہے ، لوگ مستقبل کے متعلق پر امید ہیں یا مایوس ۔ اور یہ سب خارجی اثرات ہیں جن پر معاشی نظام از خود کوئی اثر نہیں ڈالتا ، ان سے متاثر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کی مقدار میں اتنی تبدیلی ہوتی رہتی ہے ۔

عملی زندگی کے تجربے نے ہمیں سکھایا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایسی کوئی غیبی طاقت نہیں جو بچت اور سرمایہ کاری کو از خود مساوی کر دے ۔ پرانے ماہرین معاشیات نے یہی نکتہ نظر انداز کر دیا تھا ، ان کے نزدیک یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ بچت ہو تو بچانے والا اسے کسی کام میں نہ لگائے ۔ اس امکان کے تسلیم کر لینے کے بعد تجارتی چکر کی توضیح ممکن ہو جاتی ہے ۔ ہم تجارتی چکر کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آمدنی میں کمی اور زیادتی کے دور کا نام ہے ۔ خوش حالی جب اپنی انتہا کو پہنچی ہوتی ہے تو کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے جس سے سرمایہ کاری کی مقدار بچت سے کم ہو جاتی ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ فرق بہت کم ہو ۔ لیکن اس سے آمدنی میں کمی شروع ہو جاتی ہے ۔ ظاہر ہے نتیجے کے طور پر بچت میں

چونکہ ملٹیپلایر معلوم کرنے کے لئے ہمیں بہت سے مختلف اندازے لگانے ہوں گے ، ان سے نپٹنے کے لئے ایک فارمولے کی مدد لے لی جائے جو لاتعداد اعداد کو جوڑنے کے سلسلے میں کام آتا ہے تو بہتر ہوگا ۔ فارمولا یہ ہے "ملٹیپلایر = $\frac{1}{1-خ}$" ۔ جبکہ "خ" مراد ہے آمدنی کا وہ حصہ جو لوگ عام استعمال پر خرچ کریں ۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ لوگ $\frac{2}{3}$ خرچ کرتے ہیں ، $\frac{2}{1-\frac{2}{3}} = \frac{1}{\frac{1}{3}} = 3$ ۔

کمی ہوتی ہے، لیکن جب قیمتیں گرنے لگتی ہیں، (اور بچت سے کم سرمایہ کاری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے) تو نفع کی توقعات میں کمی ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے پیداوار میں اور کمی ہو سکتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری میں اور بھی کمی ہو سکتی ہے، اس طرح ایک چکر سا بندھ جاتا ہے اور بچت اور سرمایہ کاری دونوں کی مقدار میں کمی ہو جاتی ہے، اور قومی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیں اس مسئلہ پر آئندہ مفصل بحث کرنا ہے، فی الحال تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس نظریے اور نظریۂ مقدار میں کیا تعلق ہے، یا دونوں کیسے ایک دوسرے کے مطابق کئے جا سکتے ہیں۔ اس بچت اور سرمایہ کاری کے نظریے کی مدد سے ہم بہت سی ایسی باتوں کی توضیح کر سکتے ہیں جن پر نظریہ مقدار سے کوئی روشنی نہیں پڑتی، مثلاً نظریہ مقدار سے بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ کہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ زر کی مقدار میں کمی کر دینے سے خوش حالی کے دور کو روک لیا جائے، یا ختم کر دیا جائے، لیکن زر کی مقدار میں اضافے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس سے لازماً قیمتوں کا گرنا بند ہو جائے گا اور کساد بازاری پر قابو حاصل ہو جائے گا۔ کاروباری لوگ جو سرمایہ کاری کا کام کرتے ہیں عام طور پر قرض کے روپیوں سے کاروبار کرتے ہیں یا کم سے کم ان کے کاروبار میں بہت خاصی مقدار قرض لئے ہوئے پیسوں کی ہوتی ہے، اور عموماً یہ لوگ قرض بنکوں سے لیتے ہیں۔ اب اگر بنک قرض دینے کے معاملہ میں سختی کریں یعنی زیادہ سود لینا شروع کر دیں تو قدرتاً سرمایہ کاری کے لئے قرض کی مقدار میں کمی ہو جائے گی، اور یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ کاری کی مقدار میں کمی ہو، اور وہ بچت سے کم ہو جائے۔

زر کی مقدار میں کمی سے خوش حالی کے دور کو ختم کر دینا ممکن ہے، لیکن لوگ سرمایہ لگاتے اس امید میں ہیں کہ اس سے نفع ہوگا۔ اگر نفع کے امکانات نہ دکھائی دے رہے ہوں تو لوگ سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور اس لئے ممکن ہے کہ زر کی مقدار میں زیادتی یا بینکوں کا قرض دینے کے معاملے میں فیاضی دکھانا، کام نہ آئے۔ کساد بازاری کے دنوں میں زر کی مقدار میں اضافے سے بھلا اسی صورت میں ہوگا جب اس سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہو، لیکن یہ اضافہ زر کی مقدار میں اضافے سے ناگزیر نہیں ہو جاتا کیونکہ مثلاً ہو سکتا ہے لوگ اتنے مایوس ہوں کہ آئندہ نفع کے امکانات ہی انہیں دکھائی نہ دے رہے ہوں، اور اس لئے سرمایہ کاری کی طرف کوئی رغبت نہ پیدا ہو،

نظریۂ مقدار سے بحث کے سلسلے میں ہم دو لفظوں سے روشناس ہو چکے ہیں۔ گردش کا زور، اور ن (یا آمدنی کا وہ حصہ جو لوگ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیں) گردش کے زور کے متعلق ہم نے یہ بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے زر کی مقدار میں کمی بیشی کی تلافی اس کی کمی تبدیلیوں سے ہو سکے لیکن اس تبدیلی کے اسباب، یا ان کی نوعیت کے متعلق نظریۂ مقدار ہمیں کچھ نہیں بتاتا۔ نظریۂ مقدار کے دوسرے اکولیشن سے اس موضوع پر تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے، ہم نے یہ دیکھا کہ گردش کے زور کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کا کتنا حصہ نقد یا زر کی شکل میں رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی پتا لگا لیا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اگر اس تناسب میں اضافہ ہو جائے تو پھر اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، اور کمی ہو جائے تو کمی لیکن نظریۂ مقدار سے ہمیں اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ اس طرح کی تبدیلیاں شروع

کیوں ہوتی ہیں۔ اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لوگ جب کوئی رقم پس انداز کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دولت کا زیادہ حصہ زر کی شکل میں منتقل کر دیتے ہیں، اس کے برخلاف سرمایہ کاری کی صورت میں تو اس کے برخلاف پائدار چیزوں کی شکل میں۔ اس لیے جب بچت سرمایہ کاری سے زیادہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی اپنی دولت کے اس تناسب کو بڑھا رہے ہیں جسے وہ زر کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے گردش کے زور میں کمی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے تو ہو سکتا ہے بجائے سرمایہ کاری کے لوگ اسے زر کی ہی شکل میں جمع کرنا پسند کریں۔ یہی وجہ ہے کہ کساد بازاری کے دنوں میں "ز" میں اضافہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ "گ" میں اس کے برخلاف کمی ہو جائے۔ اس کے برخلاف جب سرمایہ کاری بچت سے زیادہ ہو تو اس سے مختلف اثرات کام کرنے لگتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نظریہ مقدار غلط ہے۔ بچت اور سرمایہ کاری کے باہمی رشتے سے تھوڑے سے عرصے میں روزگار اور قیمتوں میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ بچت سرمایہ کاری سے زیادہ ہو تو قیمتیں توازن کی سطح سے نیچے آ جاتی ہیں۔ بچت سرمایہ کاری سے کم ہو تو اس کے برخلاف قیمتیں توازن کی حد سے آگے نکل جاتی ہیں۔ لیکن توازن کی صورت میں قیمتوں کی سطح کیا ہو گی، اس کا دارومدار کسی نہ کسی حد تک زر کی مقدار پر ہی ہوتا ہے۔ خوش حالی کے زمانے میں زر کی مقدار میں اضافے کے بغیر قیمتوں میں اضافے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ یہ اضافے دائمی صورت اختیار کر لیں الا آنکہ اس دوران میں زر کی مقدار میں ہی اضافے ہو جائیں۔

جیسا کہ کراؤ تھر نے کہا ہے " ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زر کی مدد سے ـــ ایک استعارے سے کام لیکر ـــ ہم سمندر کی اوسط سطح کا پتہ پا سکتے ہیں، نظریۂ آمد خرچ یا بچت اور سرمایہ کاری کے نظرئے کی مدد سے ہم مدوجزر کی شدت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔"

لیکن اب بھی ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے کہ اس نظرئے کی مدد سے ہم تجارتی مدوجزر کی وضاحت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

چھٹا باب

نظریہ آمد و خرچ اور تجارتی مدوجزر کا سوال

پچھلے باب میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ کیسے آمدنی کا انحصار مجموعی خرچ کی مقدار پر ہوتا ہے، ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ مجموعی خرچ کی مقدار کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ لوگ کتنی رقم عام استعمال کی چیزوں کے خریدنے پر خرچ کرتے ہیں اور کتنی سرمایہ کاری پر۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "خرچ" اور "سرمایہ کاری" میں کونسا عنصر تجارتی چکر کے سلسلے میں زیادہ اہم کہا جا سکتا ہے، بلکہ صحیح یہ ہوگا کہ کس طرف سے تجارتی چکر کے آغاز کے اسباب زیادہ اکٹھا ہو سکتے ہیں۔

پچھلے باب میں ہم نے سرمایہ کاری کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس کی مقدار میں بہت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ آئیے اب ذرا اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ بات قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کہ عام استعمال کی چیزوں پر خرچ میں ایک طرح کا استحکام ہو، کیونکہ یہ ضرورتیں ہر شخص ہر وقت محسوس کرے گا۔ اس لئے آمدنی زیادہ ہو یا کم اس "خرچ" کی مقدار میں ایک طرح کا استحکام ہوتا ہے، تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ امریکہ میں سنہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کی کساد بازاری کے دنوں میں عام استعمال کی چیزوں کی خرید کی مقدار پر اثر تو ضرور پڑا کیونکہ بہت سے

لوگوں کے پاس بیروزگاری کی بدولت روزی کا اور اس لئے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے ذرائع کی بہت کمی ہو گئی۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں "خرچ" کے تناسب میں محض ۱۹ فیصدی کی کمی ہوئی، لیکن اس ایک برس میں سرمایہ کاری کی مقدار میں کوئی ۴۸ فیصدی کی کمی ہو گئی۔ ۱۹۲۹ء کی کساد بازاری کے دنوں میں بھی یہی ہوا۔ اس وقت کی مروجہ قیمتوں کے مطابق ۱۹۳۲ء میں سرمایہ کاری کی مقدار میں ۸۰ فیصدی کمی ہو گئی، لیکن عام خرچ کی کمی کا تناسب اس کے نصف سے بھی کم رہا۔ ۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء کی خوشحالی کے دنوں میں امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی کا کوئی ۲۱ فیصدی سرمایہ کاری کا رہینِ منت تھا، عام استعمال کی چیزوں کی خرید سے باقی ۷۹ فیصدی آمدنی وجود میں آئی تھی۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کے تین سالوں میں، جو کساد بازاری کے سال تھے مجموعی طور پر عام استعمال کی چیزوں سے ۹۰ فیصدی آمدنی وجود میں آئی، سرمایہ کاری سے محض ۱۰ فیصدی۔

اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ جہاں تک عام استعمال کی چیزوں کی خرید کا تعلق ہے، مجموعی آمدنی کی تخلیق میں ان کا حصہ مقدار کے لحاظ سے تو یقیناً اہم ہے، (آئندہ چلکر ہم دیکھیں گے کہ کیسے یہ عنصر تجارتی چکر کے مد و جزر کو حد سے گزرنے سے روکنے کا ذریعہ بنتا ہے) لیکن آمدنی کی تبدیلیوں میں انھیں سبب کا درجہ نہیں دیا جاتا کیونکہ اس خرچ کی مقدار میں ایک طرح کا استوار کام ہوتا ہے، تبدیلیوں کے شروع کرنے کی ذمہ داری سرمایہ کاری پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں ایک خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے سرمایہ کاری کی کمی بیشی، یا اس کی مقدار میں تبدیلیاں بچت کی مقدار میں تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

لیکن تھوڑا سا غور کیجیے تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ بچت کی مقدار میں تبدیلیاں تجارتی چکر کا سبب نہیں اثر یا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ بچت کی مقدار میں کمی بیشی بنیادی طور پر آمدنی کی کمی بیشی پر مبنی ہوتی ہے، اور آمدنی کی کمی بیشی کا دار و مدار بچت اور سرمایہ کاری کے باہمی تعلق پر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بچت کی مقدار میں کمی یا زیادتی تجارتی چکر کا نتیجہ ہوتی ہے، اور اس لیے اس کا سبب نہیں ہو سکتی۔ گو اس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بچت کی مجموعی مقدار کے تعین میں آمدنی کی مقدار کے علاوہ ایک اثر اور بھی کام کرتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آمدنی اگر نہ ہو، یا بہت کم ہو تو بچت کی صلاحیت ہی نہیں ہوگی اور پیسے پس انداز کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے بعد لوگ یہ فیصلہ اپنی اپنی ضرورتوں، یا مستقبل کے متعلق اپنے اپنے اندازوں کی بنیاد پر کرتے ہیں کہ کتنی رقم پس انداز کی جائے۔ اور افراد کے یہ فیصلے بھی بچت کی مجموعی مقدار کو بڑی حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس سلسلے میں اہم تر بات یہ ہے کہ آمدنی کی مجموعی مقدار کیا ہے اور اس کا دار و مدار جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں اس پر ہوتا ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری کا رشتہ کیا ہے، اور ان کی بدولت خوش حالی کے حالات ہیں یا کساد بازاری کے۔ اس لیے بچت خود نتیجہ ہے اسباب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تجارتی چکر کے شروع کرنے کی ذمہ داری سرمایہ کاری کی مقدار کی کمی بیشی پر ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد آیئے اب اس نظریے کی مدد سے تجارتی چکر کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے آیئے یہ دیکھیں کہ پیداوار کی مقدار

اور قیمتوں میں کمی کیونکر شروع ہوتی ہے۔ اس ابتدائی کمی کے اسباب سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے، فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی بھی وجہ جس سے سرمایہ کاری کی مقدار بچت سے کم ہو جائے اس سے آمدنی میں کمی ہو جائے گی، تجارتی چکر کی خصوصیت یہ ہے کہ آمدنی میں کمی یا زیادتی کا رجحان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ کچھ عرصے تک کام کرتا ہے اور پھر اس رجحان میں تبدیلی ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں اسی سوال سے بحث کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کمی کے رجحانات ظاہر ہوں تو وہ پھر آمدنی کو کم ہی کرتے جاتے ہیں۔

جب سرمایہ کاری کی مقدار بچت سے کم ہو جائے تو لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگلے دور میں آمدنی میں کمی ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دور میں جب لوگوں کی آمدنیاں کم ہو چکی ہوں گی لوگ انہیں عام استعمال کی چیزوں کے خریدنے اور بچانے میں کس تناسب سے کام لیں گے۔ ظاہر ہے اس تناسب کے تعین میں بہت سے اثرات کام کریں گے۔ اگر مشینوں وغیرہ کے دام میں تھوڑی ہی سی کمی ہو، اور یہ توقع ہو کہ آمدنی میں کمی عارضی ثابت ہوگی تو قیاس یہ ہے کہ لوگ "خرچ" میں تھوڑی ہی کمی کریں گے، اور آمدنی میں کمی کا زیادہ نمایاں اثر یہ ہوگا کہ بچت کی مقدار میں کمی ہو جائے۔ لیکن اگر قیمتوں میں کمی نمایاں ہو، اور مستقبل کے متعلق یہ اندیشہ کہ آمدنی میں اور بھی کمی ہوگی تو "خرچ" میں بہت زیادہ کمی ہو جائے گی، جب آمدنی میں کمی کا رجحان پیدا ہو جائے تو بچت اور "خرچ" کے تناسب پر دو متضاد قسم کے اثرات کام کرتے ہیں، آمدنی میں کمی کی بدولت بچانا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ مستقبل بہت ہی غیر یقینی ہو جاتا ہے۔

اس لئے "کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر - کے اصول پر بچانا ضروری ہو جاتا ہے۔
اور زیادہ امکان یہ ہوتا ہے کہ "خرچ" میں تھوڑی سی کمی ضرور ہوگی۔ اور اگر
آمدنی گرتی ہی رہتی ہے تو "خرچ" میں بھی کمی کا ہونا ناگزیر ہوتا جائے گا۔ اب
جب اس خرچ میں کمی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان صنعتوں کی پیداوار کی بکری
میں کمی ہوگی جو یہ چیزیں بناتی ہیں اب ان کے لئے یہ ضروری ہو جائے گا (سرمایہ دارانہ
نظام میں پیداوار کا مقصد نفع کمانا ہی ہوتا ہے) کہ پیداوار میں کمی کریں۔ اس کا
مطلب یہ ہوگا کہ کچھ مزدور بے کار ہوں گے، ان کی تنخواہوں میں کمی ہوگی یا انھیں
تھوڑی دیر کے لئے ہی روز کام ملے گا۔ ان تمام وجہوں سے ان کے ہاتھ میں قوت
خرید کم ہوگی۔ اگر پیداوار اجارہ داروں کے ہاتھ میں ہو تو چونکہ وہ اپنی قیمتوں
میں کمی نہیں کریں گے اس لئے لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے ہاتھ میں جو صنعتیں
ہوں گی ان میں مانگ میں ذرا سی کمی سے بھی روزگار اور پیداوار میں بہت
قابل لحاظ کمی ہو جائے گی۔ اس طرح یہ چکر بندھ جائے گا کہ مختلف صنعتوں میں
بیروزگاری سے ان میں کام کرنے والوں کی آمدنیاں کم ہوں، اور پھر اس کا اثر
بڑھتا اور پھیلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ساری معاشی زندگی کساد بازاری کا شکار
ہو جائے۔

نظری طور پر یہ سوچنا ممکن ہے کہ جب "خرچ" میں کمی ہو تو سرمایہ کاری
میں اضافے سے اس کی تلافی ہو جائے۔ لیکن ہم نے اوپر یہ بتایا ہے کہ ان دونوں
میں سرمایہ کاری میں زیادہ تبدیلیاں ہوتی ہیں، اور بیروزگاری کے دنوں میں اس میں
اور بھی کمی ہو جاتی ہے اس لئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ خرچ میں کمی کی تلافی اس

زیادتی سے ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہوتا یہ ہے کہ "خرچ" میں تھوڑی سی کمی (یا زیادتی) سے سرمایہ کاری میں بہت زیادہ کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ ہر تجارتی چکر کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ صنعتیں جو مشینوں وغیرہ کی پیداوار کا کام کرتی ہیں ان پر کساد بازاری اور خوشحالی کا اثر خاص طور پر بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جب چیزوں کی قیمتیں گر رہی ہوں تو مستقبل کے متعلق ایک طرح کی مایوسی چھا جاتی ہے۔ نئی مشینوں کے لگانے سے کتنا منافع ہوگا؟ اس کے متعلق عام طور پر اندازے یہ ہوتے ہیں کہ منافع بہت کم ہوگا، اس لئے نئی مشینیں خریدنے پر کوئی بہت زیادہ آمادہ نہیں ہوتا۔ نئی مشینوں کی مانگ ظاہر ہے محض اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی مدد سے زیادہ چیزیں پیدا کی جا سکیں گی، خوشحالی کے دنوں میں چیزوں کی پیداوار کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، اور یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ مانگ بڑھے گی اس لئے نئی مشینوں کے خریدنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ توقع ہوتی ہے کہ جب یہ مشینیں لگائی جائیں گی تو ان سے لگاتار بہت عرصے تک کام لیا جا سکے گا۔ جب چیزوں کی مانگ میں اضافہ نہ ہو رہا ہو تو نئی مشینوں کے استعمال کے متعلق یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ کچھ عرصے تک ہو سکے گا۔ قیمتوں میں کمی شروع ہو جاتی ہے تو پھر لوگ نئی مشینوں وغیرہ کا خریدنا اس لئے بھی کم کر دیتے ہیں کہ یہ توقع ہوتی ہے کہ قیمتوں میں مزید کمی ہوگی، اور زیادہ سستی چیز خریدنا ممکن ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں قیمتوں میں کمی سے مستقبل میں نفع کمانے کی امیدیں مدھم پڑ جاتی ہیں اس لئے سرمایہ کاری کی مقدار اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

ہمارے نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سا کاروبار

قرض کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جب مستقبل کے متعلق یہ توقع ہو کہ نفع زیادہ ہوگا تو قرض کی رقم پر عام طور پر جو سود دینا ہوتا ہے وہ نہیں کھلتا، لیکن جب نفع کی اُمید کم ہو تو سود میں بھی کمی ہو جانی چاہئے ورنہ قرض لینے پر لوگ بڑی مشکل سے تیار ہوں گے۔ سود کے متعلق ہم آئندہ کچھ تفصیل سے بحث کریں گے، فی الحال اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ شرح سود میں ردوبدل اتنی تیزی سے نہیں ہوتا کہ نفع میں کمی کی تلافی ہو جائے اور سرمایہ کاری کی مقدار میں کمی نہ ہو۔ جب نئی مشینوں کی خرید سے نفع کے امکان میں کمی ہوتی ہے تو لوگ نئی مشینوں کے خریدنے کے لئے قرض لینے میں کمی کر دیتے ہیں۔ جب قرض کی مانگ میں کمی ہوتی ہے تو قدرتاً شرح سود میں کمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے رجحانات برسرِکار آجاتے ہیں کہ یہ کمی بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ مثلاً قیمتوں میں جب کمی ہونے لگتی ہے تو اس امید میں کہ اس صورت حال سے آئندہ فائدہ اٹھانا ممکن ہوگا لوگ نقد بچانا شروع کر دیتے ہیں، اس سے قدرتاً قرض دینے والوں کی بھی کمی ہو جاتی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ رقم کم ہو جاتی ہے جو قرض دینے کے کام میں آتی۔ اس طرح سرمایہ کاری میں کام آنے والی رقم کی رسد میں بھی کمی ہو جاتی ہے پھر جیسے جیسے شرح سود میں کمی ہوتی ہے بہت سے لوگ جو معمولی حالات میں قرض دینے پر آمادہ ہو جاتے وہ یہ سمجھ کر کہ اس سودے میں نقصان کے اندیشے ہیں اور جو سود ملنے والا ہے وہ اس نقصان کے اندیشے کی تلافی کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے بھی قرض کے لئے جو رقم حاصل ہو سکتی ہے اس کی مقدار میں کمی ہو جاتی ہے اور شرح سود میں کافی کمی نہیں ہو پاتی۔ جیسا کہ پروفیسر ہیم نے کہا ہے۔

شرح سود کا اثر پائدار چیزوں کی پیداوار پر مقابلتاً زیادہ پڑتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ پائدار چیزوں کی پیداوار میں وقت زیادہ لگتا ہے چونکہ مشینوں وغیرہ کی تیاری میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے، اس لئے جب ان کی رسد میں اضافہ بھی ہو تو قیمتوں وغیرہ پر اثر بہت دیر میں پڑتا ہے اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ منافع کی شرح بہت عرصے تک اپنی جگہ پر قائم رہے اور نتیجتاً ایسی چیزوں کی پیداوار زیادہ کر دی جائے۔ اس کے برخلاف جب نفع کے امکانات کم ہو جاتے ہیں تو چونکہ نقصان بھی بہت دنوں تک ہوتا رہتا ہے اس لئے نئی مشینوں کی پیداوار پر عرصے تک ناخوش گوار اثر پڑتا رہتا ہے۔ سرمایہ کاری یا مشینوں وغیرہ کی پیداوار میں مقابلتاً زیادہ ناپائداری* کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جب چیزوں کی قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو لازماً آمدنی میں کمی ہوتی ہے اور آمدنی میں کمی سے "خرچ" میں کمی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً آمدنی پر اور بھی ایسے اثرات پڑتے ہیں جن سے اس میں مزید کمی ہو جائے۔ ہم نے "ملٹیپلائر" کے سمجھانے کے سلسلے میں دیکھا ہے کہ کس طرح سرمایہ کاری میں کمی زیادتی سے آمدنی میں اس سے کئی گنا کمی یا زیادتی ہوگی جب آمدنی میں کمی

---

*نا: پائدار چیزوں کی خرید کے سلسلے میں سرمایہ کاری میں ایک ند وجہ سے بھی کمی ہو جاتی ہے۔ کسی بھی وقت ہر کاروبار میں مکمل شدہ، نیم مکمل شدہ چیزوں کا ایک اسٹاک ہوتا ہے۔ جب چیزوں کی خرید کی رفتار میں کمی ہوتی ہے تو انٹرپرینیور اس اسٹاک کو کم کرنا شروع کر دیتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۲۹ء کے بعد کے چھ سالوں میں اس طرح سرمایہ کاری میں ۱۹۲۹ء کی مروجہ قیمتوں کے لحاظ سے) ۹۰۸۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر کی کمی ہو گئی تھی۔ اسٹاک میں یہ کمی بھی روزگار میں کمی کو سہارا دیتی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب کچھ چیزیں فروخت ہو جاتی ہیں تو اسٹاک میں ان کی جگہ پر کرنے کے لئے کوئی پیداوار نہیں ہوتی۔

ہو جاتی ہے تو ہر قدم پر یہ "ملٹی پلایر" اثر کام کرتا ہے، یہاں تک کہ معمولی سی کمی کی بدولت آمدنی میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔ سرمایہ کاری یا مشینوں کی خریداری ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ زیادہ عام استعمال کی چیزیں پیدا کی جا سکیں جب عام استعمال کی چیزوں کی مانگ میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے تو اس کا اثر مشینوں وغیرہ کی پیداوار پر اور بھی زیادہ شدید پڑتا ہے، تھوڑے سے اضافے سے ان کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ اور تھوڑی سی کمی سے کئی گنا کمی ہو جاتی ہے۔ اسے انگریزی میں (ACCELERATION PRINCIPLE) کا نام دیا گیا ہے ملٹی پلایر اور ایکسیلریشن کے اصول کی مدد سے ہم یہ واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کمی یا بیشی کسی طرح کا رجحان جب ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے تو آمدنی میں کمی یا بیشی ہی ہوتی جاتی ہے، اور یہ سلسلہ کچھ عرصے تک قائم رہتا ہے۔

روزگار میں کمی کے کسی دور میں عام تصویر کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے جیسی ہم نے ابھی کھینچی ہے، بچت کے مقابلے میں سرمایہ کاری میں تھوڑی سی کمی سے آمدنی میں کمی ہو جاتی ہے اور اس کمی سے "خرچ" میں کمی ہوتی ہے "خرچ" کی کمی کی بدولت ان صنعتوں کی پیداوار میں کمی ہوتی ہے جو عام استعمال کی چیزیں تیار کرتی ہیں۔ "خرچ" کی کمی سے پائدار چیزیں تیار کرنے والی صنعتوں پر اور بھی گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ مشینوں وغیرہ کی مانگ کا دار و مدار بالآخر عام استعمال کی چیزوں کی مانگ پر ہی ہوتا ہے، اس میں تھوڑی سی کمی سے مشینوں کی پیداوار میں بہت زیادہ کمی اور تھوڑے سے اضافے سے بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ کچھ عرصے تک جاری رہتا ہے یہاں تک کہ بچت اور سرمایہ کاری پھر

برابر ہو جاتے ہیں، اور روزگار میں اضافے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔
اس بحث میں ایک سوال کا جواب بالکل ہی نہیں آیا، کمی ہوتی کیوں ہے، سرمایہ کاری بچت سے کم ہوتی ہی کیوں ہے؟ دوسرے الفاظ میں کساد بازاری آتی کیوں ہے، ہم نے آمدنی و خرچ کے نظریے کی مدد سے یہ دیکھا ہے کہ کساد بازاری کی شکل میں ہوتا کیا ہے؟ خود کساد بازاری کا سبب ہمیں ابھی تلاش کرنا ہے۔ یہ موضوع بہت جھگڑے کا ہے، اور ایک ابتدائی کتاب میں ان تمام نظریوں کا ذکر بھی ممکن نہیں جو اس سلسلے میں رائج نہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا سبب سورج میں کچھ دھبے ہیں جو وقتاً فوقتاً پیدا ہو جاتے ہیں، کچھ کہتے ہیں انسانی فطرت میں ناپائداری ہے، کبھی آدمی بہت پرامید ہوتا ہے، اور کبھی اس پر بہت مایوسی چھا جاتی ہے، جب وہ پرامید ہوتا ہے تو خوشحالی ہوتی ہے، جب اس پر مایوسی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو معاشی نظام پر کساد بازاری کا تسلط ہو جاتا ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زر کی مقدار میں کمی بیشی اس کی ذمہ دار ہے غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں، اور اس لئے کوئی ایسی بات کہنا جس پر سبھی متفق ہوں تقریباً ناممکن ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کساد بازاری کے آغاز میں بہت سی چیزیں معاون ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ ہے کہ خوشحالی جب عروج پر پہونچ چکی ہو تو مستقبل میں نئی مشینوں کے لگانے سے نفع کی توقعات نسبتاً مدھم پڑ سکتی ہیں، سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ظاہر ہے وہ کاروبار جن میں نفع کی امیدیں اور امکانات زیادہ ہوں تعداد میں کم ہوتے جائیں گے۔
ہم نے دیکھا ہے کہ سرمایہ کاری میں مقابلتہً زیادہ ناپائداری ہوتی ہے۔ خوشحالی کے

دنوں میں اس میں عام "خرچ" میں اضافے سے زیادہ تیزی سے ہوتا ہے،
کچھ تو اس لیے کہ جب قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو قدرتاً بچت میں بھی
اضافہ ہوتا ہے اور خوش حالی کے دنوں میں فضا ایسی ہوتی ہے کہ بچت کی رقم
بیکار نہیں رہنے پاتی، اور کچھ اس لیے کہ ان ہی وجوہ سے بینک بھی قرض دینے
میں زیادہ فیاض ہو جاتے ہیں۔ نئی ایجادوں سے جلدی جلدی فائدہ اٹھانے کی
کوشش ہونے لگتی ہے۔ پیداوار میں اضافے کی خاطر پرانی مشینوں کی مرمت
اور انہیں بدلنے کے لیے نئی مشینوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے لیکن ان سب
چیزوں کی ایک حد ہوتی ہے، اور یہ حد جلد یا بدیر آجاتی ہے، اور جب وہ امکانا
کم یا ختم ہو جاتے ہیں جہاں زیادہ نفع کی صورت ہوتی ہے تو سرمایہ کاری میں کمی
شروع ہو سکتی ہے۔ اجرتوں میں اضافے سے بھی سرمایہ دار کا دل ڈر سکتا ہے۔
محصولوں میں اضافے سے تو اس کا دل بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے خارجی اثرات
جیسے کہیں سے حملے کا ڈر بھی اپنا کام کر سکتے ہیں، مثلاً ہمارے ملک میں پچھلے تین چار
سال میں کبھی سرمایہ کاری میں کمی کے اسباب کے طور پر کبھی کشمیر کی لڑائی، کبھی حیدرآباد
میں ہنگامے کا ڈر کا ذکر سنائی دیتا رہا ہے، اجرتوں اور محصولوں میں زیادتی کا
رونا تو ہر کمپنی کی جنرل میٹنگ میں سنائی دینے لگا ہے۔ پھر ہماری موجودہ سوسائٹی میں سٹہ
بازی نے ایک مستقل ادارے کی جگہ حاصل کر لی ہے، سٹہ بازی کے لیے زیادہ موزوں
نام جوا ہے۔ اور جواری کبھی ہارتا ہے کبھی جیتتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کبھی ایسا ہو جائے
کہ اس طرف سے کمپنیوں کے حصوں کا دام متاثر ہو جائیں اور ان کی وجہ سے کاروبار
بیٹھنے لگے۔ غرض اس طرح کساد بازاری کا آغاز بہت سی وجوہ سے ہو سکتا ہے،

لیکن ہمیں کسی ایسے سبب کی تلاش کرنی ہے جو ہر کساد بازاری کا سبب کہا جا سکے۔
آمد و خرچ کے نظریے کے آغاز کی کہانی بیان کرتے وقت ہم نے کہا تھا کہ یہ نظریہ وجود میں اس بحث کی بدولت آیا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں قوتِ خرید کی کمی ہوئی ہے یا نہیں کینیس نے اس نظریۂ آمد و خرچ کو تجارتی چکر کی توضیح کے سلسلے میں نہیں استعمال کیا ہے لیکن کینیس نے اس نظریہ کی تعمیر میں جو بنیادی تصورات استعمال کیے ہیں اُن کی مدد سے اس موضوع پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اس خصوصیت کا کہ اس میں خوش حالی اور کساد بازاری کا ایک چکر سا رہتا ہے خوش حالی کچھ عرصے تک قائم رہتی ہے، پھر کساد بازاری کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے بنیادی سبب ہمیں عام "خرچ" کی مقدار میں ڈھونڈھنا چاہیئے، کساد بازاری کا سبب کینس کی رائے میں "خرچ" کی مقدار کا ناکافی ہونا ہے۔ خوش حالی کے دنوں میں جب قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو عام "خرچ" میں اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ دولت کی تقسیم ہماری موجودہ سوسائٹی میں بہت ہی غیر مساوی ہے، اور قومی آمدنی میں اضافے کا بہت غیر متناسب حصہ ان لوگوں کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے جن کی آمدنی یوں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے "خرچ" میں اضافے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، اس لیے خوش حالی میں اضافہ عارضی ثابت ہوتا ہے۔ چیزیں پیدا اسی لیے ہوتی ہیں کہ استعمال کی جائیں لیکن ان چیزوں کے لیے "خرچ" کی مقدار میں اضافہ کافی تیزی سے نہیں ہو پاتا اس لیے پہلے عام استعمال کی چیزیں تیار کرنے والی صنعتوں میں اور پھر یہ چیزیں تیار کرنے والی مشینیں بنانے والے کارخانوں میں بے روزگاری پھیل جاتی ہے، اور پھر

اس کی بدولت ایسے اثرات برسرکار آجاتے ہیں کہ معیشت از خود بے روزگاری کی دلدل میں پھسلتی ہی جاتی ہے،

قدرتاً اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایکبار کمی کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی وہ طاقت پکڑتے رہتے ہیں تو پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر طرف بیروزگاری پھیل جائے پیداوار یکسر بند ہو جائے، اور قومی آمدنی صفر پر پہونچ جائے ؟ جیسے اس سوال کے جواب کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ کمی یا کساد بازاری کا آغاز کیونکر ہوتا ہے ویسے ہی یہ سوال بھی جھگڑے کا سوال ہے، کہ کساد بازاری کے سلسلے کو کون سے اثرات روک کر، اور پھر اصلاح حال کے امکانات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عام "خرچ" کے تصور کی مدد سے ہم اس سوال کا بہت تشفی بخش جواب دے سکتے ہیں۔ بیروزگاری کی بدولت لوگوں کی آمدنی میں کمی ہوتی ہے تو قدرتاً "خرچ" میں کمی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے "خرچ" میں اس کمی کی بھی ایک حد ہے، اور جب یہ حد آجاتی ہے تو "خرچ" میں کمی ختم ہی ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنی بچت کو کام میں لائیں گے، اور دوسرے مختلف ذریعے استعمال کریں گے تاکہ "خرچ" کی ایک خاص سطح پر قائم رہ سکیں۔ اور یہیں سے کساد بازاری کا زور کم ہو جاتا ہے ایکبار جب ہر چیز میں کمی کا یہ رجحان کمزور پڑ جاتا ہے پھر اصلاح حال کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بہت سی باتیں مدد دیتی ہیں، پچھلی کساد بازاری کے دنوں میں بہت سی مشینوں کو بدلنے، اور ان کی مرمت کے سلسلے میں تھوڑی بہت ضرورت پڑتی رہی ہوگی، یہ ضرورت جہاں تک ممکن ہوگا

لوگ ملتوی کر دیتے ہوں گے، لیکن اس کی بھی ایک حد ہے، جب "خرچ" کی مقدار ایک جگہ جم جائے گی تو اتنی پیداوار کے لئے بھی کچھ مشینوں کی مرمت اور کچھ مشینیں بدلنے کی ضرورت کا التوا ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح عام استعمال کی اُن چیزوں کی مانگ میں بھی کچھ اضافہ ہو سکتا ہے جو نسبتاً پائدار ہوتی ہیں، کیوں کہ کساد بازاری کے دوران میں انھیں بھی بدلنے کی ضرورت ہو گئی ہوگی۔ ایسے خارجی اثرات جیسے نئی ایجادیں وغیرہ بھی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ کساد بازاری کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے مزدور بیکار ہوں گے، اور بہت سے کارخانے بند پڑے ہوں گے، اس لئے صرف پیداوار کے کم ہو جانے کا بھی امکان ہے، صرف پیداوار میں کمی سے مستقبل میں نفع کے امکانات بھی مقابلتہً زیادہ ہو جائیں گے، اس لئے قنوطیت کا زور بھی ہلکا ہوگا، ایک بات اور بھی ان بدلے ہوئے حالات میں کام آ سکتی ہے۔ ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ کساد بازاری کے دنوں میں بینک وغیرہ قرض دینے کے بارے میں بہت محتاط ہو جائیں گے، اور اپنے قرض واپس مانگ کر زیادہ رقم محفوظ سرمائے کے طور پر رکھ چھوڑیں گے تاکہ اگر امانت جمع کرانے والے اپنی امانتیں بڑی مقدار میں بھی واپس لینا چاہیں تو بینک کو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس طرح ان کے پاس محفوظ سرمایہ کافی ہوگا جس کی بنیاد پر بینک بڑی مقدار میں زرِ اعتبار پیدا کر سکیں گے۔ اس طرح ہی سرمایہ کاری کے لئے کافی رقم اُدھار مل سکے گی، اور چونکہ ابھی شرحِ سود بھی کم ہوگی، کیونکہ کساد بازاری کے

دنوں میں اس میں کچھ نہ کچھ کمی ہوئی ہوگی اس لیے جب کساد بازاری کا زور ہلکا پڑے گا، اور مایوسی کی فضا ذرا بدلے گی تو لوگ قرض لینا بھی چاہیں گے ایسے میں بعض اور ذرائع سے بھی قرض کے لیے رقموں کی فراہمی کا انتظام ہو سکے گا، لوگوں کے ہاتھ میں کچھ بچت کی رقم محفوظ ہوگی کیونکہ کساد بازاری کے دنوں میں بھی لوگوں نے کچھ رقمیں بچائی ہوں گی۔ کچھ چھپی ہوئی پچھلی دولت بھی اب پھر کام آنے لگے گی، اس طرح قرض کے لیے دینے کو کافی فنڈ موجود ہوگا۔ یہ بہت سے اثرات اصلاح حال کے سلسلے میں مددگار ہو سکتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ ان میں سے کونسا عنصر فیصلہ کن ہے، بہت دشوار ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے کمی کے رجحان کے پیدا کرنے کی ذمہ داری "خرچ" کی رقم کی کمی پر ہوتی ہے، اسی طرح اس رجحان کو ایک خاص حد تک پہونچا کر اسے بدلنا بھی اسی کا کام ہے "خرچ" رجحان کا تصور ہی دونوں ہی صورتوں کی تشفی بخش توضیح ممکن بنا دیتا ہے۔ اور یہ سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے کہ کیوں سرمایہ دارانہ نظام تجارت اور پیداوار میں اس مد جزر کا شکار رہے۔ بنیادی تصور اور سبب یہی ہے، اس کی مدد اور بہت سے اثرات کر سکتے ہیں۔

اب ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ ایک مرتبہ جب اصلاح حال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو خوش حالی کا دور کیوں کچھ عرصے تک خود بخود نہ صرف قائم رہتا ہے، بلکہ روزگار کا پیداوار کا وغیرہ میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے سبب یہ ہے کچھ بھی ہو بہتری کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ کاری کی مقدار بچت سے زیادہ ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی آمدنی

میں اضافہ ہوتا ہے، اس سے پیداوار کی مانگ بڑھتی ہے، جس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مختلف کاروبار میں لوگوں کو نفع ہوتا ہے اور آئندہ کے لئے زیادہ پیداوار کا سامان بہم پہونچ جاتا ہے کیونکہ مستقبل میں زیادہ نفع کی توقعات قائم ہو جائیں گی، اب جب پیداوار میں اور اسلئے روزگار میں اضافہ ہوگا تو قدرتاً کچھ اور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا جو ان صنعتوں میں اب ملازمت پاسکیں گے۔ وہ لوگ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ عام استعمال کی چیزوں کے حاصل کرنے میں خرچ کریں گے اس لئے ملٹیپلائر اثر کے تحت آمدنی میں کئی گنا اضافے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اس صورت حال کو کچھ اور سہارا اس اصول کے عمل میں آنے سے ملیگا کہ عام استعمال کی چیزوں کی مانگ میں تھوڑا سا اضافہ سرمایہ کاری میں کئی گنا زیادہ اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ ہم نے کساد بازاری کے رجحانات کو ازخود تقویت پہونچانے والے عناصر کے ذکر کے سلسلے میں اس اصول سے کام لیا تھا، اب اس پر تھوڑی سی تفصیل سے بحث کر لینا چاہئیے تاکہ یہ اصول پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سیموئلسن کی کتاب سے ایک مثال بہت مفید ہوگی۔ فرض کیجئے کپڑے کی کوئی مل اس بات کا لحاظ کرتی ہے کہ سالانہ پیداوار کی قیمت سے دس گنا زیادہ دام کی مشینیں ہمیشہ اپنے کارخانے میں رکھے۔ اب اگر کئی برس ایسا ہو کہ اس کی بکری ۶ لاکھ روپے کی رہے تو اس کے پاس ۶۰ لاکھ کی قیمت کی مشینیں ہونگی۔ فرض کیجئے کہ ۶۰ لاکھ میں ۴۰ مشینیں آتی ہیں اور ان میں سے ہر سال

ایک مشین بیکار ہو جاتی ہے۔ اس کی تلافی کے لیے ہر برس یہ کارخانہ تین لاکھ کی مشینیں خریدے گا۔ اب فرض کیجیے کہ چوتھے سال میں بکری میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہو جاتا ہے، چھ لاکھ سے نو لاکھ۔ اب مشینوں کی تعداد میں بھی ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہونا چاہیے، بیس لاکھ کے بجائے تیس لاکھ۔ چوتھے سال میں ۱۱ مشینوں کی ضرورت ہوگی، دس نئی مشینیں اور ایک پرانی مشین کو بدلنے کی خاطر۔ بکری میں تو محض ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے لیکن مشین کی مانگ میں (۱۰۰۰) فیصدی کا اضافہ ہو گیا۔ صرف میں اضافے کا سرمایہ کاری پر اثر کتنا نمایاں ہے، ذیل کا نقشہ اس اصول کی کارکردگی کی وضاحت کے سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :-

مدت	سالانہ بکری	سرمایہ کی مجموعی قیمت	سالانہ سرمایہ سرکاری	مجموعی سرمایہ کاری۔ نئی مشینیں۔ پرانی مشین کی تبدیلی
		پہلا دور		
پہلا سال	۶ لاکھ	۶۰ لاکھ	۵	ایک مشین کی خرید، پرانی مشین کو بدلنے کے لیے۔ تین لاکھ میں۔
دوسرا سال	"	"	"	"
تیسرا سال	"	"	"	"
		دوسرا دور		
چوتھا سال	۹ لاکھ	۹۰	۳۰	ایک مشین پرانی مشین کے بدلے میں ۱۰ نئی مشینیں ۳۳ لاکھ میں
پانچواں سال	۱۲ "	۱۲۰	۳۰	" " "
چھٹا سال	۱۵ "	۱۵۰	۳۰	" " "

اس مثال سے یہ واضح ہو جائے گا کہ سرمایہ کاری میں استحکام کی شرط یہ ہے کہ صرف میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی کمی ہو جائے تو کل عمارت ڈھ جائے گی مثلاً اوپر کی مثال میں اگر ساتویں سال میں صرف میں اضافہ نہ ہو، بس ۱۵ لاکھ کی بکری ہی ہو سکے تو سالانہ سرمایہ کاری صفر ہو جائے گی۔ صرف میں کمی اور اضافے سے سرمایہ کاری میں کئی گنا کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے اسی لئے اس اصول کو "تیز رفتاری کا اصول" کہتے ہیں۔

ہمیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ خوش حالی اور کساد بازاری کے دنوں میں ان صنعتوں پر نمایاں اثر پڑتا ہے جو مشینیں وغیرہ تیار کرتی ہیں اور جن کی خرید کو ہم اصطلاح میں سرمایہ کاری کا نام دیتے ہیں۔ اوپر کی بحث سے یہ اصول بھی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ سرمایہ کاری کی یہ خصوصیت موجودہ معاشی نظام کے عدم استحکام کا خاص سبب ہے۔ یہاں محض بہ سبیل تذکرہ یہ کہنا نامناسب نہیں ہو گا کہ یہ عدم استحکام ذاتی ملکیت کی بدولت اتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ معاشی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت ہوتے ہیں، پیداوار کی مقدار، نوعیت اور اس قسم کے تمام بنیادی سوالات ہر شخص الگ الگ طے کرتا ہے، اس طرح معاشی نظام کی کارکردگی کسی سوچے سمجھے منصوبے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اندھے انفرادی فیصلوں پر ہوتی ہے، اس خرابی کو دور کرنا ہے تو ہمیں منصوبہ بندی کا سہارا لینا ہو گا کیونکہ اسی صورت میں ہم اس عدم استحکام سے نجات پا سکیں گے۔

لیکن اس چھوٹی سی کتاب کا مقصد صرف نظامِ زر کی کارکردگی کے

متعلق بنیادی باتوں کا سمجھنا سمجھانا ہے۔ اس لیئے اس بحث کو مختصر ہی رکھنا چاہیئے۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کے عدم استحکام کا بنیادی سبب کیا ہے، پھر ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے کہ معاشی نظام کچھ عرصے تک خوشحالی اور پھر کساد بازاری لاتا ہے۔ اس پوری بحث میں زر کی مقدار کا ذکر کہیں بھی نہیں آیا، اس لیئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں زر کا رول کیا ہوتا ہے۔ اتنی بات تو واضح ہو گئی ہے کہ زر اور پیداوار یا روزگار کی مقدار وغیرہ کا باہمی تعلق اتنا سیدھا سادا نہیں جو نظریہ مقدار زر بتاتا ہے۔ لیکن زر کے پیدا کردہ اثرات اپنی جگہ پر پھر بھی اہم ہیں، مثلاً ہم نے پچھلی گفتگو میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بینک اپنی کارروائیوں سے کساد بازاری، اور خوشحالی دونوں ہی کو مدد پہنچاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بینک جو زر اعتبار پیدا کرتے ہیں اس کی مقدار میں برابر رد و بدل ہوتا رہتا ہے، بعض لوگ اسی رد و بدل کو معاشی مد و جزر کا سبب بتاتے ہیں۔ ہم نے یہ رائے رد کی ہے لیکن اس بحث سے اس عنصر کی اہمیت ضرور واضح ہو گئی ہو گی۔ زر کی مقدار کی اہمیت کیا ہے، اور زر کی مقدار میں رد و بدل سے قیمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

نظریہ مقدار پر تنقید کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ اس کے ماننے والے قیمتوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قیمتوں میں کمی بیشی معاشی مد و جزر کا سبب ہے، لیکن اب ہم نے یہ دیکھا کہ یہ مد و جزر خود قیمتوں میں رد و بدل کا سبب ہوتا ہے، ہم نے اب یہ بھی دیکھا

لیا ہے کہ یہ مدوجزر کیوں ہمارے موجودہ نظام کا لازمی جزبنا ہوا ہے ہمیں
اب یہ معلوم کرنا ہے کہ قیمتوں کا تعین کیونکر ہوتا ہے جیسا کہ پروفیسر الون
ہنسین نے کہا ہے قیمتوں کا دارومدار کچھ تو اس پر ہوتا ہے کہ مختلف عناصر
پیداوار کو ان کی خدمت کا کیا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اور کچھ اس پر کہ پیداوار
کتنی ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ دوسرے عناصر پیداوار کی اجرت میں
تبدیلی مزدوری میں تبدیلی کے تناسب سے ہوتی ہے تو عام قیمتوں کا دارومدار
اس پر ہوگا کہ مزدوری اور مجموعی پیداوار کا رشتہ کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے
کہ سب عناصر پیداوار کی اجرت قومی آمدنی کے برابر ہوتی ہے، اس لئے
آمد و خرچ کے نظریئے کے لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیمتوں کی سطح کا دارومدار
اس پر ہوتا ہے کہ آمدنی یا مجموعی طلب کا مجموعی پیداوار کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔

زر کی مقدار کا قیمتوں پر جو کچھ بھی اثر پڑ سکتا ہے وہ بالواسطہ پڑ سکتا ہے
کیونکہ یہ ممکن ہے کہ زر کی مقدار میں اضافے سے مجموعی خرچ یا مجموعی طلب پر
اثر پڑے۔ نظریے مقدار کے لحاظ سے ماننے والے سمجھتے ہیں کہ زر کی مقدار
میں جو کچھ بھی اضافہ ہو اسے خرچ کیا جائے گا کیونکہ زر کا مقصد ہی یہی ہے کہ
اس کی مدد سے چیزیں حاصل کی جائیں۔ اس لئے ان کے لحاظ سے زر کی مقدار
میں اضافے سے لازماً آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے خرچ میں بھی اضافہ
ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ مختلف چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے زر کی
مانگ بڑھ کر بڑھی ہوئی زر کی مقدار کے برابر ہوجاتی ہے۔ اس صورت حال کا
قیمتوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر روزگار اپنی حد کو پہونچا ہو جہاں کوئی بھی بیکار

نہ ہو تو اس اضافے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے لیکن اگر بیروزگاری کی حالت ہو اور مختلف عناصر پیداوار کا حاصل کرنا آسان ہو تو زر کی مقدار میں اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی پیداوار میں اضافہ ہو یہاں تک کہ تمام چیزوں کی خرید و فروخت کی مقدار اس حد کو پہونچ جائے جسکی زر کی مقدار متقاضی ہے۔ اس صورت میں قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوگا۔

اول الذکر صورت میں ہوگا یہ کہ قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف عناصر پیداوار کے معاوضوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح نقد آمدنی کی سطح زر کی بڑھی ہوئی مقدار کے لحاظ سے بڑھ جائے گی۔ اس حالت میں بھی قیمتیں اتنی بڑھ چکی ہوں گی کہ زر کی مانگ زر کی مقدار کے برابر ہو جائے۔ دوسری صورت میں یہ ہوگا کہ روزگار میں اضافہ ہو جائے یہاں تک کہ آمدنی اور زر کی بڑھی ہوئی مقدار میں توازن پیدا ہو جائے۔ یہ یاد رہنا چاہیئے کہ ان دونوں صورتوں میں زر کی مانگ کا دارو مدار آمدنی کی سطح پر ہے۔

لیکن زر کی مانگ محض اس لئے ہی نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعے سے چیزیں خریدی جائیں اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زر کو ایک قیمتی چیز کی حیثیت سے محفوظ رکھا جائے جہاں تک زر کی مانگ چیزوں کی خرید کیلیئے ہوتی ہے زر کی مقدار میں اضافے سے آمدنی میں اضافہ ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ مجموعی پیداوار میں یا قیمتوں میں یا دونوں ہی میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ہر نیا زر دستاویزوں وغیرہ کی خرید میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں شرح سود میں کمی ہوگی، اور جب شرح سود گرے گی تو لوگ نقد اپنے ہاتھ میں

رکھنے کو ترجیح دے سکتے ہیں اس صورت میں نتیجہ ہو گا کہ زر کی مقدار میں اضافے کے بعد اس وقت تک یہ نیا زر دستاویزیں وغیرہ خریدنے کے کام میں آئے گا جب تک کہ شرح سود اتنی نہ گر جائے کہ لوگ زر کی وہ مقدار نقد کی شکل میں اپنے ہاتھ میں رکھنے پر آمادہ ہو جائیں جو چیزوں کی خرید و فروخت کا کام انجام دینے کے بعد باقی بچ رہتی ہے۔ زر کی مانگ کا دارومدار اس معنی میں شرح سود پر[1] ہوتا ہے۔

کینس نے ہمیں سکھایا کہ بنیادی سوال روزگار کا ہے، اور روزگار، یا دوسرے لفظوں میں آمدنی سے باقی اور چیزوں کا تعین ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس نظریے کی طرف بہت سے لوگوں کی تحریروں میں اشارے ملتے ہیں، مثلاً ڈولک نے

---

[1] اس گفتگو کو سمجھنے کیلئے ہمیں مختصراً کینس کا نظریہ شرح سود سمجھ لینا چاہیئے۔ کلاسیکل اسکول کے ماہرین معاشیات کا خیال یہ تھا کہ معاشی نظام ہر لمحہ اپنی صلاحیت بھر پیداوار مہیا کرتا رہتا ہے، ان کے خیال میں بچت کی ہر پائی لازماً سرمایہ کاری کے کام میں آجاتی تھی، اس لئے عناصر پیداوار کے بیکار رہنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بچت اور سرمایہ کاری میں توازن پیدا کرنے کا کام سود کی شرح رد و بدل کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ اگر سرمایہ کاری بچت سے زیادہ ہوتی تو شرح سود میں اضافہ ہو جاتا اور لازماً سرمایہ کاری میں کمی ہو جاتی، ادھر شرح سود میں اضافے سے بچت کی مقدار میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح کے رد و بدل سے بازار میں وہ شرح سود رواج پاتا جس پر بچت اور سرمایہ کاری برابر ہوں، یا دوسرے الفاظ میں جس پر سرمایہ کاری کے لئے بچت کی مانگ اور بچت کی رسد دونوں برابر ہوں۔ یہ ماہرین معاشیات سمجھتے تھے کہ بچت کا ایک ہی مقصد تھا کہ اسے سرمایہ کاری کے کام میں لگایا جائے۔ کینس نے اس سلسلے میں دو نوں پر خاص طور پر بہت زور دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے جو رقم حاصل کی جا سکتی ہو یہ دونوں ایک چیز نہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی وقت یا دور کی بچت سرمایہ کاری کے لئے فنڈ مہیا کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ لوگ کبھی روپیہ بچا کر یا چھپا کر رکھ سکتے ہیں، اور کبھی انہیں اپنے اندوختوں سے باہر نکال سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس پر کینس نے بہت زور دیا ہے وہ آمدنی کی سطح ہے۔

کینس کے نظریۂ سود کو "نقد پسندی" کے نظریے کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ کینس نے کہا ہے کہ سود نقد دینے کی قیمت ہے۔ شرح سود کا تعین اس سے ہوتا ہے کہ لوگ نقد زیادہ پسند کرتے ہیں یا کم، شرح سود کے تعین میں ایک طرف تو یہ بات اہم ہوتی ہے کہ لوگ کتنی رقم نقد رکھنا پسند کرتے ہیں اور دوسری طرف اس بات پر کہ زر کی مقدار کیا ہے۔

صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ قیمتوں کا تعین آمدنی سے ہوتا ہے، لیکن کینس نے ایک منظم نظریے میں بہت سے بنیادی تصورات کو ملا کر ایک نظریے کی بنیاد ڈالی، اور یہی ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ جیسا کہ پروفیسر پیگو کا خیال ہے کینس کے نظریے کے متعلق، ان کی کتاب سے ذیل کا اقتباس بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ "روزگار کی سطح کے تعین میں بنیادی اثرات تین کہے جا سکتے ہیں، "سب سے اہم تو تین نفسیاتی عناصر ہیں جو یہ طے کرتے ہیں کہ لوگ آمدنی کا کتنا حصہ "خرچ" کرتے ہیں، کتنی رقم اپنے ہاتھ میں نقد کی شکل میں بیکار رکھنا چاہتے ہیں اور مستقبل میں اشیاء سے اصل (مشینیں اور اس قسم کی اور چیزیں) سے حاصل ہونے والی آمدنی کے متعلق لوگوں کی توقعات کیا ہیں، دوسرا اہم اثر مروجہ سطح اجرت کا ہوتا ہے، یہ اجرت مالکوں اور مزدوروں کے آپس میں طے کرتے ہیں، اور تیسرے زر کی مقدار کیا ہوتی ہے، اس مقدار کا تعین مرکزی بنک کرتا ہے۔" روزگار کی سطح کیا ہوگی، اس کا دارومدار ان ہی تین اثرات پر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کینس کی اسکیم کے لحاظ سے زر اور قیمتوں کا تعلق اتنا سیدھا سادہ نہیں ہو سکتا جتنا نظریۂ مقدار کو ماننے والے بتاتے ہیں۔ کینس کی رائے میں زر کی مقدار مجموعی خرچ پر اثر ڈال سکتی ہے، اور چونکہ اس خرچ سے عام استعمال کی چیزوں کی خرید، یا دوسرے الفاظ میں آمدنی کے اس تناسب پر پڑ سکتا ہے جو لوگ "خرچ" کرنا چاہتے ہیں، پھر اس سے ان توقعات پر بھی اثر پڑ سکتا ہے جو مستقبل میں مشینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کے متعلق قائم کی جاتی ہیں، نیز اس صورت میں لوگوں کا یہ فیصلہ بھی بدل سکتا ہے کہ اپنی آمدنی کا کتنا حصہ نقد کی شکل میں اپنے

ہاتھ میں رکھیں جس کی بدولت شرح سود پر اثر پڑے گا اس لئے زر کی مقدار میں اضافے سے دوسرے بنیادی عناصر پر کچھ اثرات پڑتے ہیں لیکن زر کی مقدار ان بنیادی عناصر میں سے ایک عنصر ہے جسے فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زر کی مقدار میں اضافے سے قیمتیں کس طرح متاثر ہونگی کچھ اور سوالات کے جواب معلوم کرنا ضروری ہوگا۔ ہم نے ابھی یہ کہا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافے سے مجموعی خرچ، یا مجموعی طلب پر اثر پڑے گا، اس کا قیمتوں پر اثر کیا ہوگا، اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ صرف پیداوار پر اس صورت حال کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے زر کی مقدار میں اضافے کا اثر معلوم کرنے کے لئے مصارف پیداوار یا لاگت کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر قیاس غالب یہ ہے کہ مجموعی طلب میں اضافہ زر کی مقدار میں اضافے کے تناسب سے نہیں ہوگا، اور قیمتوں کی تبدیلی بھی مجموعی طلب کی تبدیلی کے تناسب سے نہیں ہوگی۔ مجموعی طالب میں اضافہ ہو تو اس کا ایک اثر تو یہ ہوگا کہ روزگار کی مقدار میں اضافہ ہو، دوسرا اثر یہ ہوگا کہ چیزوں کی مانگ میں اضافے کی بدولت قیمتوں میں اضافہ ہو جائے۔ اس کا دارومدار کہ قیمتوں میں زیادہ اضافہ ہوگا یا روزگار کی مقدار میں اس بات پر ہوگا کہ زر کی مقدار میں اضافے کے وقت عام روزگار کی حالت کیا ہے۔ اگر سب عناصر پیداوار کام سے لگے ہوئے ہیں تو قیمتوں میں اضافہ زیادہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں پیداوار میں اضافے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی اجرتوں میں اضافہ ہو جائے، لیکن اگر بیروزگاری کی حالت ہو تو روزگار کی مقدار میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہوگا اور قیمتیں کم از کم

شروع میں نہیں بڑھیں گی۔
زر کی مقدار میں اضافے سے مجموعی طلب پر اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ اثر کیا ہوگا یہ خاصا پیچیدہ سوال ہے۔ یہ تو ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ اثر کن راستوں سے پڑے گا۔ سب سے پہلے تو ہمیں ہر قدم پر یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ نئے زر کا کتنا حصہ چیزوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے، اور کتنا حصہ لوگ نقد کی شکل میں اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ پھر یہ سوال ہے کہ نیا زر کس طبقے کے ہاتھ میں آتا ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ چل سکے گا، کہ "خرچ" زیادہ حصہ ہوگا یا بچایا جائے گا، اگر "خرچ" زیادہ ہو تو اس کا ملٹیپلائر پر اثر زیادہ ہوگا۔ اور اور بھی دوسرے نتائج ہوں گے، مثلاً سرمایہ کاری میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان سب کے متعلق ظاہر ہے کہ کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ہیں بس یہ معلوم ہو گیا کہ زر کا مختلف بنیادی عناصر سے کیا رشتہ ہے، کسی خاص وقت میں کسی خاص تبدیلی کا مجموعی صورت حال پر کیا اثر پڑے گا اس کا پتہ لگانے کے لئے ان تمام بنیادی رشتوں پر غور کرنا ہوگا۔ موٹے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زر کی مقدار میں تبدیلی سے قیمتوں پر کیا اثر ہوگا۔ اس کا دارومدار ایک طرف تو اس پر ہے کہ نئے زر کا کتنا حصہ لوگ نقد کی شکل میں رکھنا چاہتے ہیں، اس سے شرح سود پر اثر پڑے گا، اور شرح سود کے راستے سے سرمایہ کاری پر کیونکہ سرمایہ کاری کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ مستقبل میں آمدنی کی توقع اور شرح سود میں کیا رشتہ ہے۔ اگر آمدنی کی توقع زیادہ ہو تو سرمایہ کاری زیادہ ہوتی ہے ورنہ نہیں اور دوسری طرف اس بات پر کہ مصارف پیداوار زر کی مقدار میں اضافے سے کیونکر متاثر ہوتے ہیں غرض زر اور قیمتوں کا تعلق بہت پیچیدہ ہے۔

ساتواں باب

زر کے متعلق پالیسی کیا ہو، اور اس کے مقاصد کیا؟

پچھلی بحث سے یہ بات ضرور ظاہر ہو گئی ہو گی کہ معاشی مدوجزر میں زر کا خاصہ حصہ ہوتا ہے، اور چیزوں سے قطع نظر روزگار کی مقدار کے تعین میں اور بنیادی اثرات کام کرتے ہیں، بچت اور سرمایہ کاری۔ جہاں تک بچت کا تعلق ہے وہ سرمایہ کاری کا ہی نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اس پر آمدنی کی سطح کے تعین کا انحصار ہوتا ہے۔ سرمایہ کاری کی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہوتا ہے، عام استعمال کی مقدار، جس سے ہم یہاں مزید بحث نہیں کریں گے۔ اور شرح سود۔ سرمایہ کاری سے پہلے سرمایہ کار یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ نفع کیا ہوگا، اور چونکہ آجکل کاروبار قرض کی رقم سے چلتا ہے اس لئے شرح سود کا اس کے تعین میں بہت اہم حصہ ہو جاتا ہے کہ سرمایہ کاری کے لئے کتنی رقم ادھار لی جائے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ شرح سود کے تعین میں زر کی مقدار کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ معاشی مدوجزر میں زر کا اور بھی حیثیتوں سے بڑا حصہ ہو سکتا ہے۔ زر کے استعمال کی دو خرابیاں بہت نمایاں کہی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے استعمال سے معاشی مدوجزر کو کسی نہ کسی حد تک سہارا ملتا ہے، دوسرے یہ کہ قیمتوں میں بہت زیادہ ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ زر کو ہم ایک پیمانے کے طور پر استعمال

کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پیمانے کو مستحکم رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بھی زر کے انتظام میں کچھ مقاصد تجویز کیے گئے ہیں۔ آیندہ صفحات میں ہم ان سے بحث کریں گے۔

ا قیمتوں کا استحکام، زر کے متعلق پالیسی کے تعین کا بہت سے لوگ یہی مقصد بتاتے ہیں کہ قیمتیں مستحکم رکھی جائیں۔ قیمتوں کی تبدیلیوں سے بہت سے برے نتائج پیدا ہوتے ہیں، اس لیے قیمتوں میں یا زر کی قیمت میں استحکام بہت ہی موزوں مقصد معلوم ہوتا ہے۔ جب قیمتیں گرتی ہیں تو روزگار میں کمی ہوتی ہے، اور دولت کی تقسیم ایک خاص طرح متاثر ہوتی ہے، اسی طرح جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو پیداوار اور روزگار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس سے ایسی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو آگے چل کر کساد بازاری کا سبب بن جاتی ہیں، اس کے برخلاف تجربہ کی شہادت یہی ہے کہ جب قیمتیں مستحکم رہتی ہیں تو خوشحالی کی کیفیت کچھ پائدار سی رہتی ہے، اور دولت کی تقسیم جیسی ہے ویسی ہی قائم رہتی ہے۔ اسی طرح جہاں تک قیمتوں کے ردوبدل کی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے یہ نظریہ اچھا ہے، لیکن اس مقصد کو قبول کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس سے خطرناک نتائج پیدا ہوسکتے ہیں، اس مقصد پر عمل کرنے کے راستے میں بعض اور بھی رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً یہ کہنا آسان ہے کہ زر کی قیمت کو مستحکم رکھا جائے لیکن زر کی کونسی قیمت؟ ہم نے دیکھا ہے کہ زر کی کسی عام قیمت کا تصور ممکن نہیں یہ صحیح ہے کہ اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ مستحکم قیمت کے طلب گار واضح طور پر اپنا مقصد نہیں بتاتے۔ اگر کسی طرح اس مقصد کی مناسب تعریف کردی جائے تو یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن پالیسی کا ظاہر ہے ایک ہی مقصد ہے کہ اس پر عمل کرکے کچھ خرابیوں کا

مقابلہ کیا جا سکے قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہی سوال پیدا ہوگا کہ کن قیمتوں کو مستحکم رکھنا چاہیئے؟ اور یہ سوال ایسا ہے کہ جس کا جواب دینا ناممکن ہے اب اگر یہ طے نہ ہو سکے کہ کس قیمت کو مستحکم رکھنا چاہیئے تو استحکام کا مقصد چاہے نظری طور پر کتنا ہی دلکش نہ ہو عملی زندگی کے لئے بیکار ہوگا۔ زر کی قیمت کے مختلف انڈکس اپنی اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں، اور ان میں بالکل علیحدہ علیحدہ تبدیلیاں ہوتی ہیں، یہ فرض کرنا ممکن نہیں کہ ایک میں جس قسم کی تبدیلی ہوگی وہی دوسروں میں بھی ہوگی۔ امریکہ میں اس مقصد کو بڑی اہمیت دی گئی ہے چنانچہ کئی بار قانوناً اس مقصد کو قبول کرانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ایسی ایک کوشش کی مخالفت کرتے ہوئے فیڈرل ریزرو بینک کے ایک عہدہ دار نے مختلف انڈکس سے مختلف نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مثلاً اگر آپ سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء کی مدت لیجئے تو بیورو آف لیبر کے تھوک کے انڈکس کے لحاظ سے قیمتوں میں کوئی ۱۲ فیصدی کی کمی ہوئی، اگر مصارف زندگی کے انڈکس کو دیکھئے تو محض ۲ فیصدی کی، لیکن اگر آپ کسی ملے جلے انڈکس کو دیکھئے جس میں بہت ہی مختلف قسم کی چیزیں شامل ہوں (ایسا ایک انڈکس مسٹر اسٹانڈر نے بنایا بھی تھا) تو پھر قیمتوں میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔

لیکن فرض کر لیجئے کہ ہم کسی طرح یہ طے بھی کر لیں کہ کن قیمتوں کے استحکام سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا تو اس کے خلاف ایک اور بنیادی اعتراض سامنے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ قیمتوں کی تبدیلی معاشی مدوجزر کا سبب نہیں نتیجہ ہوتی ہے۔ اس مقصد کے ماننے والے ماہرین معاشیات یہ بات تسلیم کرتے ہیں لیکن ان سے

اہم نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ قیمتوں میں کمی ایک طرح کی خطرے کی گھنٹی کا کام کرتی ہے اور جیسے ہی بنیادی حالات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے قیمتیں بدلنے لگتی ہیں۔ اس لیئے اس مقصد کو مان لینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قبل اسکے کہ کوئی خطرناک صورت پیدا ہو حکومت کوئی اقدام کر سکے گی۔ لیکن یہ مفروضہ خاص خاص حالات میں ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ جیسے ہی کسی بنیادی عنصر میں کوئی تبدیلی ہو۔ قیمتیں بھی متاثر ہو جائیں۔ اگر مختلف صنعتوں میں مقابلے کی حالت ہو تو شاید یہ توقع پوری ہو جائے، لیکن موجودہ زمانے میں اجارہ داری کا رجحان دن بہ دن قوی ہوتا جا رہا ہے اور اس رجحان کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جب مثلاً مجموعی طلب میں کمی ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ روزگار اور پیداوار کی مقدار میں کمی کی شکل میں ہوتا ہے، قیمتوں میں کمی بہت بعد میں آتی ہے کیونکہ بڑے اجارہ دار حتی الوسع قیمتیں مستحکم رکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے پیداوار اور اس لیئے روزگار کی مقدار میں زیادہ ردوبدل کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ قیمتوں میں تبدیلی اس وقت شروع ہو جب پانی سر سے اونچا جا چکا ہو، جیسا کہ فڈرل رزرو بنک نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے، "قیمتوں کے انڈکس میں ہمیں ایک بیتی بات کا ذکر ملتا ہے"۔ فڈرل رزرو سسٹم نے اس لیئے ہی اس پروگرام کی مخالفت کی تھی کہ ان کے خیال میں قیمتوں کی کمی خطرے کی گھنٹی اس وقت بجاتی ہے جب کساد بازاری کے شعلے معاشی نظام کو اپنی گود میں لے چکے ہوتے ہیں، اور اس وقت آگ کو روکنے کی کوشش نہیں، اسے بجھانے کی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک بات اور۔ قیمتوں کی سب تبدیلیاں نقصان دہ نہیں ہوتیں زر کی مقدار میں کمی بیشی، چاہے وہ حکومت کی پالیسی کا نتیجہ ہو یا اس وجہ سے کہ لوگ نقد جمع کرنا یا استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں، پیداوار میں کمی بیشی، آبادی ہیں اضافے یا اس طرح کے اور بنیادی اسباب کی بدولت بھی جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ سبھی نقصان دہ ہوں لیکن اگر مثلاً قیمتوں میں کمی اس لئے ہو کہ پیداوار کے طریقے بدل گئے ہیں اور صرف پیداوار میں کمی ہو گئی ہے تو یہ تبدیلی نقصان دہ نہیں ہو گی۔ کیونکہ ان کی بدولت مروجہ شرح منافع میں کمی نہیں ہو گی، بلکہ یہ تبدیلیاں اگر نہ ہوئیں تو اس سے نقصان ہو سکتا ہے کیونکہ زیادہ منافع کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ پیداوار میں غیر متناسب اضافے ہو جائیں اور پھر ان کی بدولت گڑ بڑی پیدا ہو۔ اس مسئلے پر تھوڑی سی بحث مناسب ہو گی، پیداوار کے صرف میں کمی کئی وجہوں سے ہو سکتی ہے، کوئی نئی ایجاد اس کو سستے طریقے سے بنانے کا باعث ہو جائے، کاروبار کے انتظام کی کوئی بہتری لاگت میں کمی کا باعث ہو جائے، مزدور زیادہ خوش ہو کر بہتر طور پر کام کرنے لگیں، غرض اس طرح بہت سی وجہوں سے صرف پیداوار میں کمی ہو سکتی ہے اب اگر عناصر پیداوار کے معاوضے میں اضافہ نہ ہو جائے تو ظاہر ہے یہ صورت ایسی ہو گی جس میں مالکوں کو مروجہ شرح سے زیادہ نفع ہو گا اور زیادہ نفع کا لازمی نتیجہ پیداوار میں توسیع جو بعض حالات میں خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ مختلف عناصر پیداوار کی ایک یونٹ جو سو پر مشتمل ہو مل کر کسی چیز کی سو یونٹ

تیار کرتی ہے، ان تمام عناصر کو معاوضے میں ۹۰ ڈالر ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک یونٹ کی اوسط لاگت ۹۰ سنٹ ہوئی۔ اب اگر یہ چیز ایک ڈالر میں بازار میں بکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انترپرینیور کو دس سنٹ کافی یونٹ نفع ہوگا۔ اب فرض کیجئے کوئی ایسی وجہ پیدا ہو جاتی ہے جس سے عناصر پیداوار کی کارکردگی میں دس فیصدی کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی اب وہ ۱۱۰ یونٹ تیار کر لیتے ہیں اب اگر ان کے معاوضے میں کوئی اضافہ نہ ہو تو ایک یونٹ کی اوسط لاگت کم ہو کر ($\frac{۹۰}{۱۱۰}$ = ۸۲) ۸۲ سنٹ ہو جائے گی، اب اگر پرانی شرح نفع باقی رکھی جائے تو اوسط قیمت گھٹ کر ۹۲ سنٹ ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر پرانی قیمت برقرار رکھی جائے اور مختلف عناصر پیداوار کے معاوضوں میں کوئی بھی تبدیلی نہ ہو تو نفع کی شرح بڑھ کر ۱۸ سنٹ فی یونٹ ہو جائے گی، اس لئے پیداوار میں توسیع ہو سکتی ہے، ظاہر ہے یہ توسیع ناپائدار اور عارضی ہوگی، تھوڑے عرصے میں نفع کی یہ شرح گھٹے گی، کیونکہ پیداوار کی لاگت میں ناگزیر طور پر اضافہ ہوگا۔ اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صورت فرضی ہے کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں مختلف عناصر پیداوار، خصوصاً مزدوروں کو اُجرت ان کی کارکردگی کے لحاظ سے پوری نہیں ملتی۔ اوپر کی گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ زر کی قیمت کا استحکام، ظاہری طور پر کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ معلوم ہو، مناسب آئیڈیل نہیں ہے۔ بظاہر مستحکم قیمتیں بڑی خرابی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک تاریخی شہادت کا بھی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں ۲۹-۱۹۲۲ء کے دوران میں اوسط قیمتیں بہت غیر معمولی طور پر مستحکم رہیں۔ (ان قیمتوں میں دستاویزوں وغیرہ کی قیمتیں شامل نہیں ہیں) لیکن بعد کے واقعات شاہد ہیں کہ اس دوران میں سرمایہ کاری کی مقدار ضرورت سے بہت زیادہ ہو گئی تھی، اور ۱۹۲۹ء میں جو کساد بازاری آئی وہ تاریخ میں آپ اپنی مثال تھی۔

(۲) غیر جانبدار زر

ایک دوسرا مقصد یہ تجویز کیا گیا ہے کہ کوئی ایسی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ زر کا اثر غیر جانبدار رہے۔ یہ مقصد پچھلے مقصد سے اس معاملے میں ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں ہی یہ چاہتے ہیں کہ معاشی معاملات میں زر کا اپنا کوئی اثر نہ پڑنے دیا جائے، یہ اثر بالکل ختم ہو جائے۔ قیمتوں میں استحکام کی تجویز کو بھی ایک معنیٰ میں غیر جانبدار کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ عام قیمتوں میں تبدیلیوں کو روک کر زر کو حساب کے ایک پیمانے کی حیثیت میں غیر جانبدار بنا دیا جائے۔ جس پالیسی کو ہم نے غیر جانبدار زر کے نام سے تعبیر کیا ہے اُس کا مقصد یہ ہے کہ زر کی مقدار میں ردوبدل سے معاشی نظام پر کوئی اثر نہ پڑنے دیا جائے۔ اس دوسری پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ مبادلے کے ذریعے کی حیثیت سے زر کا کوئی بُرا اثر نہ پڑے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ زر کی مجموعی مقدار ایک سی رہے۔ جیسا کہ پروفیسر ھیسیم نے کہا ہے۔ "اُن دونوں پر

اگر عمل کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ زر کو اس کے دونوں مقاصد کے لحاظ سے استحکام حاصل ہو جائے گا، مبادلہ کے ذریعے کی حیثیت سے بھی اور قیمتوں کے پیمانے کی حیثیت سے بھی گو کہ حیثیتوں سے یہ دونوں مقاصد ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔

اس خیال کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کو جس مدوجزر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے اسباب ہمیں زر کے اندر ڈھونڈھنے چاہئیں۔ اگر زر کی بدولت مختلف قسم کی خرابیاں پیدا نہ ہو جائیں تو معاشی مدوجزر کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں کی جاتی ہے۔ زر کے استعمال سے لین دین دو حصوں میں بٹ جاتی ہے، کسی چیز کی فروخت زر کی مدد سے، اور پھر زر کی ہی مدد سے کسی چیز کی خرید۔ اگر لین دین میں زر کا استعمال نہ ہو تو آپ کوئی چیز دیکر ہی کوئی اور چیز حاصل کر سکیں گے، لیکن جب زر کا استعمال ہو تو خرید اور فروخت ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر زر کی مقدار میں اضافہ ہو جائے تو اس کا کم سے کم فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن چیزوں کی رسد نہیں بڑھتی۔ اسی طرح اگر زر کی مقدار میں کمی ہو جائے تو چیزوں کی مانگ میں کمی ہو جاتی ہے، اور پیداوار اور روزگار میں کمی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس لئے زر کی مقدار میں ردوبدل ہی خرابی کی جڑ ہے کیونکہ اسکی بدولت چیزوں کی طلب اور رسد میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے، یہ زر کا ہی پھیلایا ہوا زہر ہے جو ہمارے معاشی نظام کی کارکردگی کو یوں خراب کر دیتا ہے۔

اگر یہ تشخیص صحیح مان لی جائے۔ اور ہماری پچھلی ساری گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تشخیص بہت ہی نامکمل ہے۔ تو پھر کرنے کا کام یہ ہوگا کہ زر کو غیر جانبدار بنانے کی خاطر زر کی مقدار میں ردوبدل بالکل ختم کردینا چاہیئے۔ لیکن زر کی مقدار میں استحکام کے تصور میں کم سے کم دو چیزوں کے لئے فوراً جگہ نکالنی ہوگی۔ ایک تو یہ کہ اگر گردش کے زور میں کوئی تبدیلی ہو تو زر کی مقدار میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دینے کے لئے یہ کرنا ہوگا کہ اس کی تلافی کا کوئی انتظام کیا جائے۔ دوسری طرف ہمیں ان بنیادی تبدیلیوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے جیسے آبادی، صنعتی ایجادات وغیرہ اور ان کی تلافی کے لئے بھی زر کی مقدار میں ردوبدل ضروری ہوسکتا ہے۔ فرض کیجیے آبادی دگنی ہوجائے تو اس کی محنت سے پیداوار میں ضرور اضافہ ہوگا اب اگر زر کی مقدار اسی تناسب سے نہ بڑھی تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں بہت کم ہوجائینگی اور قیمتوں کی کمی ہم جانتے ہیں بڑی خرابیوں کا باعث ہوسکتی ہے۔ کسی بھی ملک میں آج اگر زر کی مقدار کم کرکے وہی کردی جائے جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں تھی تو قیمتوں میں بے پناہ کمی، اور شدید کساد بازاری ناگزیر ہوجائیں۔ اس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ غیر جانبدار زر کا تصور یوں کتنا ہی اچھا کیوں نہ معلوم ہو اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس سے شدید کساد بازاری کے اسباب وجود میں آسکتے ہیں۔

پیداوار کی مقدار میں اضافہ کئی صورتوں سے ہوسکتا ہے۔ نئی ایجادات اور اس طرح کے دوسرے اسباب کی بنا پر پیداوار میں اضافہ ہوگا، اور

اتنی ہی محنت، اتنی ہی لاگت سے زیادہ چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی قیمت اسی تناسب سے کم ہو جائے تو زر کی مقدار کو مستحکم رکھنے سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے لئے ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ جیسے ہی اس طرح کی کوئی ترقی ہو ویسے ہی قیمتوں میں اسی کے لحاظ سے کمی بھی کر دی جائے گی۔ اور جیسا کہ پروفیسر الون ہنسن نے کہا ہے "اجارہ داری کی ترقی، کارٹل یا اور ایسے اداروں کا عروج جو اجارہ دار یا نیم اجارہ دار ہیں اس مفروضے کو حقیقت سے بہت دور کی چیز بنا دیتا ہے" پھر اس سے قطع نظر یہ بات قرین قیاس نہیں کہ سبھی چیزوں کے بنانے کے ہنر میں بہ یک وقت ایک سی ہی تبدیلی ہوگی، مختلف قیمتوں پر مختلف طرح کے اثرات پڑیں گے۔ مرکزی بنک اگر کچھ کر سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ زر کی مقدار کو غیر جانبدار رکھے۔ اب چونکہ نئی ایجادات کی بدولت پیداوار میں کچھ اضافہ ہوگا، اس لئے سبھی قیمتیں گریں گی۔ لیکن یہ نہیں کیا جا سکتا کہ صرف ان چیزوں کی قیمتیں چن چن کر کم کر دی جائیں جن کے بنانے میں اب لاگت کم آنے لگی ہے۔ زر کی مقدار کا استحکام، یا غیر جانبدار زر درحقیقت اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے، لگا تو تیر نہیں تو تکا، اور نشانہ خطا ہوا تو کساد بازاری کا سامنا ناگزیر ہے۔

پروفیسر ھیسیم نے ایک اور قسم کی مثال سے اس رائے کی خرابی دکھائی، فرض کیجئے کوئی ملک آج کسی اور ملک پر قابض ہو جائے اور مفتوح ملک کے سکے واپس لیکر یہ اعلان کر دے کہ فاتح ملک کے سکے ہی دونوں ملکوں کیلئے

کام آئیں گے۔ اب اگر فاتح ملک کے سکوں میں اتنا ہی اضافہ نہ کر دیا جائے، جتنا مفتوح ملک کے سکوں کی واپسی نے ضروری بنا دیا ہے تو قیمتوں میں بہت کمی ہو گی اور اس سے دوسری خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس مثال میں زر کی مقدار میں کمی ہو گئی ہے اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ یہ مثال غیر جانبدار زر کے تصور کے ساتھ زیادتی ہے۔ لیکن اس طرح معیشت میں توسیع آبادی میں اضافے سے بھی ہو سکتی ہے، پیداوار میں اضافہ آبادی میں اضافے کی بدولت بھی ہو سکتا ہے۔ اب اگر ہم یہ فرض کریں کہ اس طرح آبادی میں اضافے کی بدولت جو پیداوار بڑھتی ہے اُس کی لاگت میں کوئی کمی نہیں ہوتی (اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لینا چاہئے کہ دوسرے عناصر پیداوار میں اضافہ اسی تناسب سے ہوتا ہے، ورنہ اگر کوئی عنصر کمیاب ہو گیا تو اس کے معاوضے میں اضافہ ہو گا اور اس سے ہماری مثال میں پیچیدگی پیدا ہو جائے گی) اب لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر زر کی مقدار مستحکم رکھی جائے تو قیمتیں گریں گی۔ اس لئے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اگر اس قسم کے اسباب کی بنا پر معیشت میں توسیع ہو یعنی فروخت کے لئے چیزوں کی مقدار میں اضافہ ہو جائے تو زر کی مقدار میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ زر کی مقدار اور چیزوں کی پیداوار کے درمیان کا پچھلا تناسب باقی رہے۔ یہ اضافہ اس لئے ضروری ہے تاکہ معیشت کے نئے ممبروں کے ہاتھ میں قوت خرید پہونچ جائے تاکہ وہ چیزیں خرید سکیں جو اب انھیں پیداوار میں اضافے کی بدولت ملتی ہیں، اور اُنھیں اسی لحاظ سے اجرت یا معاوضے دئے جا سکیں جیسے ان کی آمد سے

پہلے رائج تھے۔ غیر جانبدار زر کے حامی اس ضرورت کو مانتے ہیں۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غیر جانبدار زر کے نظریہ کو ان لوگوں نے بہت اہمیت دی ہے جو اس کے قائل ہیں کہ معاشی نظام کو یکسر آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جیسے چاہے کام کرے، اس کی کارکردگی میں جو مختلف قسم کی حکومت یا اور طرح کی رکاوٹیں ڈالی جانے لگی ہیں وہی اُن کے خیال میں کُل فساد کی جڑ ہیں۔ غیر جانبدار زر کا نظریہ ان کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ زر کی کارکردگی میں حکومت کے انتظام کو کوئی دخل نہ ہونے پائے لیکن اگر ان کے اس منصوبے پر عمل کیا جائے تو حکومت کو یا جس کے ذمہ بھی زر کا انتظام سپرد ہو بہت ہی زبردست انتظامی مشینری کام میں لانی ہوگی۔ زر کی مقدار میں استحکام یا زر کو غیر جانبدار رکھنے کے لئے اسے ہر وقت یہ بات دھیان میں رکھنی ہوگی کہ کہیں گردش کے زور میں تو ردوبدل نہیں ہو رہا ہے۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہو تو اسے زر کی مقدار میں اس رجحان کی تلافی کی خاطر مناسب تبدیلی کرنی ہوگی۔ اگر معیشت میں کوئی توسیع ہو تو اسکی تلافی میں زر کی مقدار میں اضافہ کرنا ہوگا، یہ بات نگاہ میں رکھنی ہوگی کہ پیداوار میں کون سے اضافے اس وجہ سے ہوئے ہیں، اور کون سی نئی ایجادات یا اس طرح کے دوسرے اسباب کے طفیل، کیونکہ غیر جانبدار زر کے حامی اس دوسری صورت کی پیدا کردہ قیمتوں کی کمی کی حالت میں، زر کی مقدار میں اضافے کو جائز نہیں سمجھتے۔

لیکن جو چیز اس نظریے کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن ہے وہ یہ بات ہے کہ اس پر عمل سے چیزوں کے بدلے میں چیزوں کے لین دین کے بجائے زر کے استعمال کی لائی ہوئی خرابیوں کا علاج ہو سکتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کا

موزوں ترین وقت وہ تھا جب اول الذکر نظام کے تحت معاشی نظام اپنی بہتر شکل میں کام کر رہا تھا اور زر کے استعمال سے ابھی اس کا دامن آلودہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ وقت گزر جانے کے بعد اب اگر کوئی ابتری پیدا ہو تو اس کا علاج اس نظریے کی مدد سے ممکن نہیں، کیونکہ یہ نہیں معلوم کہ زر غیر جانبدار ہوتا تو کیا ہو فرض کیجیے آج ہمارے نظام میں کوئی ابتری ہو اور اس کا سبب بھی زر کی ہی لائی ہوئی کوئی مصیبت ہو تو موجودہ دقتوں کا حل ہم اس طرح نہیں پا سکتے کہ یہ بتا دیں کہ اگر غیر جانبدار زر ہوتا تو یہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ ہمارے عہد کا — یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کا۔ سب سے ٹیڑھا سوال یہ ہے کہ کساد بازاری کے رجحان کو کیونکہ ختم کیا جائے۔ اور اس کام میں اول الذکر دونوں ہی مقاصد ناکافی ہیں۔

موجودہ رجحان یہ ہے کہ مقصد کا تعین یوں کیا جائے کہ زر کے انتظام کے ذریعہ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ کام کی مقدار اس سے زیادہ ہو جائے جتنے کام کرنے والے ہوں۔ اسے اصطلاحاً "مکمل روزگار" کا بھی نام دیا جاتا ہے لیکن اس حالت کا ٹھیک ٹھیک تعین یا اس کی ایسی تعریف جسے سبھی مان لیں خاصا مشکل کام ہے۔ کراؤتھر نے اس کی تعریف کرنے کی کوشش یوں کی ہے۔ "مکمل روزگار اس حالت کا نام ہے جب مختلف چیزوں کی مانگ اور ان کی رسد دونوں برابر ہوں" مگر یہ تعریف بہت ہی غیر تشفی بخش ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرمایہ کاری اور بچت میں جب بھی توازن پیدا ہو جائے یہ شرط پوری ہو جائے گی، لیکن یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ کاری اور بچت کا توازن معیاری ہو

اِس معیاری کی تعریف کچھ یوں کی جا سکتی ہے کہ ایسی صورت میں جب کسی ملک میں موجودہ ذرائع پیداوار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا ہو تو اس وقت سرمایہ کاری اور بچت کے توازن کو معیاری کہا جا سکتا ہے "مکمل روزگار" کی کیفیت کی وضاحت تبھی ہم اتنی اس طرح کر سکتے ہیں کہ یہ کہیں کہ ایسی صورت جب موجودہ ذرائع پوری طرح کام میں لائے جا رہے ہوں "مکمل روزگار" کی حالت پیدا کر دے گی۔ سرمایہ داری ہمیں ایسی صورت حال کے پیدا کرنے کی کوئی ضمانت نہیں دیتی، امریکہ کے متعلق تواعداد و شمار کی شہادت موجود ہے کہ امن کے زمانے میں کبھی بھی اس کا معاشی نظام اپنی صلاحیت بھر پیداوار نہیں پیدا کر سکا۔ لڑائی یا لڑائی کی تیاریاں سرمایہ داری کی ایسی کارکردگی کے لئے لازمی معلوم ہوتی ہیں۔

کیا کیا جا سکتا ہے؟

ہم نے اب مقصد کا تعین کر لیا ہے۔ یہ معلوم کر لیا ہے کہ زر کے انتظام میں کس معیار تک پہونچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ معیار یہ ہے کہ سوسائٹی کے موجودہ ذرائع پوری طرح پیداوار کا کام کریں۔ مگر ہماری گفتگو زر تک محدود ہے۔ یعنی یہاں اس سوال سے بحث کرنا ہے کہ زر کے متعلق پالیسی سے 'کیا کچھ' اور کیونکر کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے مطالعہ کے درمیان یہ دیکھا ہے کہ معاشی مدوجزر کی ایک نمایاں خصوصیت سرمایہ کاری میں ردوبدل ہے۔ اس لئے بات کو آسانی سے سمجھنے

کی خاطر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ کاری) کو متاثر کر لیا جائے تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ جہاں تک زر کا اور اس کے انتظام کا تعلق ہے ہم سرمایہ کاری کو ہی متاثر کر سکتے ہیں، اور اسے متاثر کرنے کیلئے ہمارے پاس واحد ذریعہ ——— یہ پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ ہمیں یہاں غرض صرف اُنہی چیزوں سے ہے جن کا تعلق زر سے ہو ——— یہ ہے کہ زر کی مقدار میں ردو بدل کر دیں، یا دوسرے الفاظ میں زر اعتبار کی مقدار میں ردو بدل کے ذریعہ سرمایہ کاری کے لئے فنڈ کی فراہمی کو آسان یا دشوار بنا دیں۔ زر کی مقدار میں مرکزی بینک کیونکر کمی یا زیادتی کر سکتا ہے یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ مرکزی بینک اگر زر کی مقدار میں اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ بازار سے وہ دستاویزیں خرید لے۔ اس طرح دوسرے بینکوں کے ہاتھ میں نقد کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی مدد سے عام بینک زر اعتبار کی مقدار میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر بینک شرح سود میں کمی کر کے قرض کی لین دین میں سہولت پیدا کر سکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ ان اختیارات سے مرکزی بینک کیا کر سکتا ہے، زر کی مقدار میں کمی و بیشی کرنا ہو تو مرکزی کتنی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ مرکزی بینک کے ان اختیارات کی پہونچ لامحدود نہیں۔ مرکزی بینک اس بارے میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتا کہ اپنے اثاثے کی مقدار میں جب اور جس طرح چاہے کمی بیشی کرے۔ مرکزی بینک دستاویزیں خرید سکتا ہے لیکن فرض کیجیے مرکزی بینک نے

سوٗ روپے کی ایک دستاویز خریدی اور اسی وقت کسی نے جس نے مرکزی بنیک سے سوٗ روپے قرض لے رکھے تھے وہ واپس کر دیئے تو بنیک کے مجموعی اثاثے اور زر کی مقدار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن یہ دقت کچھ ایسی اہم نہیں ہے کیونکہ اگر مرکزی بنیک کچھ عرصے تک دستاویزیں بیچتا رہے تو پھر ان کا زر کی مقدار پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ لیکن مرکزی بنیک کے لئے اپنے اثاثے کے کم کرنے کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی دقت پیدا ہو سکتی ہے۔ مرکزی بینک اگر دستاویزیں بیچے تو زر کی لین دین میں دقت پیدا ہو گی کیونکہ نقد سمٹ کر مرکزی بنیک کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ لیکن مرکزی بنیک کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُس وقت بھی قرض دیتا ہے جب کوئی اور نہ دے۔ اب اگر فنڈ کا حصول ممکن نہ ہو تو بعض وہ ادارے جو ڈسکاؤنٹ کا بزنس کرتے ہیں مرکزی بنیک سے دستاویزوں اور حصوں کی ضمانت پر قرض لے سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بازار میں نقد کی کمی سے شرح سود میں اضافہ ہو گا اور اس لئے مرکزی بنیک سے قرض لینا اب زیادہ مہنگا پڑے گا۔ لیکن جہاں تک قرض کے حصول کا تعلق ہے وہ اب بھی ممکن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح قرض جلد واپس کرنے کا رجحان مضبوط ہو جائے گا۔ ایک بات اور، مرکزی بنیک دستاویزیں بیچ کر زر اعتبار کی مقدار میں کمی اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کے پاس بیچنے کو کافی دستاویزیں ہوں۔ انگلستان میں مرکزی بنیک کے لئے یہ دقت محض نظری ہے، لیکن امریکہ میں اس کا بہت امکان ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی دستاویزوں

وغیرہ کی لین دین کے لئے ایک باقاعدہ، منظم بازار وجود میں نہیں آسکا ہے، اس لئے اس ذریعہ سے زرِ اعتبار کی مقدار میں کمی ہمارے ملک کے حالات میں بہت زیادہ آسان نہیں ہوگی۔ لیکن ان باتوں کے باوجود یہ بات صحیح ہے کہ مرکزی بینک کو یہ اختیار بہت بڑی حد تک حاصل ہے کہ وہ چاہے تو بینکوں کے نقد اثاثے کی مقدار میں کمی بیشی کر سکے۔

زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ نقد اثاثے میں کمی بیشی ہو تو عام بینک اعتباری اسی تناسب سے کمی بیشی بھی کریں گے یا نہیں۔ اس کا دار و مدار ایک تو اس بات پر ہوگا کہ بینک کس تناسب سے زرِ محفوظ رکھنے کے عادی ہیں۔ انگلستان میں عام طور پر بینک جس تناسب سے نقد محفوظ رکھتے ہیں اس میں بہت کمی بیشی نہیں ہوتی، اس لئے وہاں یہ یقینی ہوتا ہے کہ مرکزی بینک جب نقد میں کمی بیشی کرے گا تو اس کا اسی تناسب سے عام بینکوں کے پیدا کردہ زرِ اعتبار پر اثر پڑیگا۔ لیکن امریکہ میں ایسا نہیں۔ قانون کی رو سے جو تناسب نقد سرمائے کے لئے متعین کر دیا گیا ہے اس سے کم تو نہیں لیکن اس سے زیادہ اکثر ہو جاتا ہے، اس لئے امریکن فیڈرل ریزرو بینک زرِ اعتبار کی مقدار میں کمی اتنی موثر طور پر نہیں کر سکتے جتنا انگلستان میں ممکن ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بینک رواج سے کچھ زیادہ ہی نقد سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب سے مرکزی بینک کا قیام ہوا ہے ہمارے ملک میں زرِ اعتبار کی مقدار کو کم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے، اس کا وقت جب آیا تبھی یہ پتہ چل سکے گا کہ ریزرو بینک اس سلسلے میں کتنا کامیاب ہوگا۔

یہ بات تسلیم کرلی جاسکتی ہے کہ مرکزی بنیک زر کی مقدار میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ لیکن زر کی مقدار میں کمی بیشی سے براہ راست سرمایہ کاری پر بہت زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اولاً تو یہ کہ بنیکر سبھی حالات میں کسی کو روپیہ قرض دینے کے معاملے میں یکساں رویہ رکھتے ہیں، کراؤ ٹھر کا کہنا ہے کہ انگلستان میں پچھلے بیس سال کے دوران میں قرض کی مقدار اس تناسب سے بہت کم رہی ہے جو بنیکر امانتوں کے مقابلے میں مناسب سمجھتے ہیں، اور اس کا امکان نہیں کہ کسی بھی صورت میں کسی ایسے آدمی کو قرض دینے سے انکار کریں گے جو کوئی "مناسب" تجویز لیکر ان کے پاس آئے گا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ قرض کی مقدار میں اضافے کا کام بنیکروں کے ہی ہاتھ میں نہیں۔ تاریخ سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ بارہا بنیکوں کے نقد سرمائے میں اضافے کے باوجود ان کے دئے ہوئے قرض کی مقدار میں کمی ہوئی ہے، محض اس لئے کہ کوئی قرض لینے والا نہیں، مثلاً جون ۱۹۳۲ء اور جون ۱۹۳۳ء کے دوران میں لندن کے بنیکوں کے پاس رکھی ہوئی زر امانت میں ۲۱۴ ملین پونڈ کا اضافہ ہوا، لیکن ان کے دئے ہوئے قرض کی مقدار میں اس دوران میں ۷۷ ملین پونڈ کی کمی ہوگئی۔

اس طرح سرمایہ کاری پر جو کچھ اثر پڑتا ہے وہ شرح سود کے راستے سے پڑتا ہے۔ شرح سود کے متعلق ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ اس کا دارومدار ایک طرف اس پر ہوتا ہے کہ پبلک کتنی رقم نقد ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے

اور دوسری طرف اس بات پر کہ زر کی مقدار کیا ہے۔ زر کی مقدار پر مرکزی بینک کا اختیار ہوتا ہے، دوسری چیز براہ راست بینک کے قابو میں نہیں ہوتی لیکن زر کی مقدار میں اضافے یا کمی سے شرح سود کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اور شرح سود میں کمی بیشی سے اس پر اثر پڑتا ہے کہ لوگ کتنا نقد رکھنا پسند کریں گے، اور مرکزی بینک شرح سود میں کمی بیشی کے رجحان کو اپنے شرح سود میں کمی بیشی سے نمایاں کر دے سکتا ہے۔ اس کی زیادہ تر اہمیت نفسیاتی ہوتی ہے کیونکہ اس سے وہ مقصد واضح ہو جاتا ہے جو مرکزی بینک کے پیش نظر ہو۔ شرح سود کا سرمایہ کاری کی مقدار پر اثر پڑتا ہے، لیکن یہ اثر نہ تو فوری ہے، نہ یقینی۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شرح سود میں اضافے سے سرمایہ کاری میں کمی کا امکان زیادہ ہے لیکن اس طرح سرمایہ کاری میں اضافے کی کوشش اتنی کامیاب نہیں ہوگی۔ پہلی بات کے متعلق بھی یہ کہنا ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں، مثلاً جب خوشحالی کا دور دورہ ہو اور قیمتیں بڑھنے لگی ہوں تو شرح سود میں بہت زیادہ اضافے کے بغیر سرمایہ کاری کو متاثر کرنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ قیمتوں میں اضافے کی بدولت نفع کی توقع زیادہ ہوگی اور اس لئے زیادہ شرح سود پر قرض لینا ممکن ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ ایسی صورت میں نفسیاتی طور پر فضا ایسی ہوتی ہے کہ نفع کے امکانات اور بھی زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ شرح سود میں تبدیلی کا کوئی اہم اثر نہیں ہوتا۔ اس بارے میں ماہرین میں بڑا اختلاف رائے ہے کہ شرح سود کی تبدیلیاں

کس طرح اثر ڈالتی ہیں، معیشت کے کن حصوں پر ان کا اثر زیادہ نمایاں ہوتا ہے کن پر کم۔ لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود یہ کہنا ممکن ہے کہ شرح سود میں تبدیلی کا اثر سب سے پہلے بازار کے اُن حصوں پر پڑتا ہے جو چھوٹی مدت کے لیے روپے کی لین دین کا کام کرتے ہیں۔ شرح سود میں اضافہ ہو تو چھوٹی مدت کے دستاویزوں کی قیمت گر جاتی ہے کیونکہ اس اضافے کی بدولت اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ کم رقم لگا کر کوئی متعین رقم سود کے طور پر حاصل کر لی جائے۔ اس قسم کی دستاویزوں کی قیمت میں کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طویل مدت کی حکومت کی دستاویزوں کے مقابلے میں یہ زیادہ مقبول ہو جاتی ہیں اور سٹہ باز اول الذکر دستاویزیں خریدنا شروع کر دیتے ہیں اور حکومت کی دستاویزیں علیحدہ کرنے لگتے ہیں۔ جب یہ بڑی مقدار میں بیچی جائیں تو لازماً ان کی قیمت میں بھی کمی ہوتی ہے اور اس کی بدولت صنعتی دستاویزوں کے مقابلے میں یہ طویل مدت دستاویزیں بھی زیادہ مقبول ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے شرح سود میں اضافے کا اثر بازار کے سبھی حصوں پر پڑتا ہے یہاں تک کہ کمپنیوں کے معمولی حصے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری کے لئے فنڈ حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ دستاویزیں بیچ کر فنڈ حاصل کرتے ہیں اُن کی قیمت میں کمی کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے کچھ اس لئے کہ نئے حصے جاری کئے جائیں تو اور دستاویزوں کی قیمت کی کمی کی بدولت ان کی قیمت بھی کم ہوتی ہے اور اس طرح بھی گھاٹا رہتا ہے۔ موجودہ نظام میں اسٹاک ایکسچینج کی بڑی

اہمیت ہے، اسے تجارتی رجحانات کا اندازہ لگانے کے لئے ایک پیمانے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، تبدیلیوں کے بارے میں ایکسچینج بہت ہی حساس ہوتا ہے۔ اگر اسٹاک ایکسچینج میں دستاویزوں کی قیمت میں کمی ہو جائے تو اس کے عام نفسیاتی اثرات بہت برے ہو سکتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرکزی بینک اگر ڈٹا رہے تو وہ اعتبار کی مقدار میں کمی کر کے شرح سود میں اضافے کے ذریعے معاشی چڑھاؤ روک کر اسے ختم کر سکتا ہے۔

دقت دراصل یہ ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرکزی بینک اگر زر کی مقدار میں اضافہ کر دے اور اس طرح شرح سود کو کم تو اس سے کساد بازاری کا علاج ہو جائے گا۔ لیکن کساد بازاری میں سرمایہ کار بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، بے حد محتاط ہو جاتا ہے۔ شرح سود میں کمی سے نفع کے امکانات اسی وقت زیادہ دکھائی دیں گے جب نفع کا تھوڑا سا امکان تو دکھائی دے رہا ہو۔ کساد بازاری کے دنوں میں تو اچھی سے اچھی اسکیم میں نفع کے امکانات صفر دکھائی دیتے ہیں، ان کے لئے قرض لینے میں ایک فی صدی شرح سود بھی پہاڑ دکھائی دے گا۔ لیکن شرح سود میں رد و بدل کا اثر محض اسلئے ہی نہیں پڑتا کہ اس کی بدولت پیداوار کی لاگت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس کا رد و بدل عام بینکوں کے لئے ایک طرح کا اشارہ ایک طرح کی تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرکزی بینک کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی انگلیاں معاشی نظام کی نبض پر ہوتی ہیں اور اسکی تشخیص

عموماً صحیح ہوگی۔ اب اگر وہ اپنے شرح سود میں رد و بدل کر دے تو یہ گویا ایک طرح کا اشارہ ہوگا کہ آگے خطرہ ہے اور عام بینکوں کو اس پالیسی کے لحاظ سے اپنا راستہ بدل لینا چاہیئے اور اپنی اعتبار کی پالیسی کو اس لحاظ سے ڈھال لینا چاہیئے۔

پچھلی لڑائی کے دوران میں انگلستان وغیرہ میں شرح سود کو بہت کم کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش کامیاب رہی۔ اس پالیسی کا جسے "سستے زر" (شرح سود میں کمی ہو تو قرض لینے میں خرچ کم ہوگا) کا نام دیا گیا ہے، مقصد یہ تھا کہ حکومت لڑائی کے اخراجات پورا کرانے کے لئے جو کچھ قرض لے اس پر خرچ زیادہ نہ ہو، وہ بہت مہنگا نہ پڑے ورنہ آگے چل کر اس کی ادائیگی کے وقت زیادہ محصول لگانا ہوگا۔ اس کے بعد سے یہ پالیسی ایک طرح دائمی سی ہو گئی ہے۔ اس کا ایک بہت اہم سبب یہ ہے کہ مختلف بینکوں نے بھاری مقدار میں حکومت کے بانڈ وغیرہ خرید رکھے ہیں، اگر اس پالیسی میں تبدیلی کر دی جائے اور نتیجہ میں شرح سود بڑھے تو ان دستاویزوں کی قیمت کم ہو جائے گی، اور اس سے بہت سے بینکوں کا نقصان ہوگا۔ ایک بات اور، شرح سود میں کمی اس لئے بھی باقی رکھی جا رہی ہے کہ اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت نے جو کچھ قرض لیا ہے وہ بہت مہنگا ہو جائے گا۔ حکومت تھوڑی مدت کے لئے بھی قرض لیتی ہے، اور بڑی مدت کے لئے بھی۔ جہاں تک دوسری قسم کے قرض کا تعلق ہے شرح سود میں اضافے کا کوئی فوری اثر نہیں پڑے گا کیونکہ جو قرض حکومت لے چکی ہے اس کے

شرح سود پر کسی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں، اس پر تو وہی سود دینا ہوگا جس پر قرض لیا گیا ہو۔ لیکن سال بہ سال اس میں سے کچھ ادا ہوتا رہے گا۔ اور جب حکومت اس کی جگہ قرض لے گی تو اس پر زیادہ سود دینا ہوگا۔ تھوڑی مدّت کے لئے جو قرض لیا جاتا ہے اس پر تو ظاہر ہے فوراً ہی اثر پڑیگا کیونکہ یہ قرض تقریباً ہر تین مہینے کے بعد نئے سر سے لیا جاتا ہے۔ اس بارے میں اب بہت شدید قسم کا اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے کہ سستے زر کی یہ پالیسی باقی رہنی چاہئے یا نہیں۔ اس کے دوسرے پہلو تو ہم یہاں نظر انداز کر دینگے کراؤتھر کو اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ پالیسی قائم رکھی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شرحِ سود میں کمی بیشی کے ذریعہ تجارت میں استحکام کی کوشش نہیں کی جا سکے گی۔ لیکن ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شرح سود میں ردوبدل کی اہمیت نفسیاتی زیادہ ہے۔ خود کراؤتھر کی ایک مثال سے اس کی یہ اہمیت کہ اس میں ردوبدل کی بدولت لاگت میں فرق پڑ جاتا ہے بہت ہی کم دکھائی دیتی ہے۔ "خوشحالی کے دنوں میں سبھی قیمتیں بڑھتی ہیں، اس لئے قیاس یہ ہے کہ ان حالات میں صنعتی حصّوں کی قیمت بھی بڑھ رہی ہوگی اور غالباً بہت تیزی سے۔ اب اگر کسی حصّہ پر سالانہ ٦ فی صدی نفع مل رہا ہو اور اسکی قیمت ہر مہینے محض پانچ فیصدی بڑھ جائے تو وہ لوگ جو حصّوں کی لین دین محض اسلئے کرتے ہیں کہ انھیں بیچ کر، خرید کر موقع موقع سے فائدہ اٹھائیں ٦٦ فی صدی شرح سود پر بھی قرض لے سکتے ہیں اور انھیں اس میں کوئی گھاٹا نہیں ہوگا"۔ یہ ظاہر ہے کہ مرکزی بنک آزاد بھی ہو تو وہ شرح سود میں اتنا

اضافہ نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس کی اہمیت نفسیاتی ہو تو وقت پڑنے پر تھوڑا سا ردوبدل ہی کافی ہوجانا چاہیئے، اور اس کا فیصلہ کرنا بہت پہلے سے ضروری نہیں۔

اس طریقے میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے موثر ہونے کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ عام بنک کیا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کھلے بازار میں دستاویزوں کی لین دین کو فضیلت حاصل ہے کیونکہ اس کام میں فیصلہ مرکزی بنک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور عام بنک ایک حد تک مجبور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام پر یہ دونوں طریقے بہ یک وقت ایک دوسرے کو سہارا دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس دوسرے طریقے کی بعض کمزوریوں کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ایک کمزوری یہ ہے کہ اگر عام بنکوں کے ہاتھ میں فاضل سرمایہ موجود ہو، اور وہ پھر بھی قرض نہ دے رہے ہوں، اس لئے کہ کوئی قرض لینے والا ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے دستاویزوں کی خرید کا کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ قرض نہ دے سکنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بنکوں کے پاس فنڈ کی کمی ہے۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اگر بنک دستاویزوں کے بدلے میں قرض حاصل کرسکتے ہیں تو دستاویزوں کی فروخت کی بدولت جو کمی زر کی مقدار میں ہونی چاہیئے وہ نہیں ہو پائے گی

اس سے نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے قطع نظر ایسے استعمال کیے جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف پڑیں۔ ان میں تطابق ہونا چاہیئے تاکہ اصل مقصد پورا ہونے کے

امکانات زیادہ ہوں۔" لیکن اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہونا یہی چاہیئے کہ جب شرح سود میں اضافہ کیا جا رہا ہو، تو دستاویزیں بھی فروخت ہونی چاہئیں۔ ان دونوں کا اثر دو طرح پڑتا ہے۔ مثلاً ڈسکاؤنٹ پالیسی کے ردوبدل کا اثر چھوٹی مدت کے شرح سود پر نمایاں طور سے پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف کھلے بازار میں دستاویزوں کی خرید و فروخت سے طویل عرصے کے شرح سود پر بھی اثر پڑتا ہے کیونکہ اس طرح دستاویزوں کی قیمتوں پر اثر پڑ سکتا ہے، اس طرح ان دونوں کو سمو کر کنٹرول کی ایک اچھی اسکیم تیار کرنا بالکل ممکن ہے۔"

ان دونوں سے کہیں زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ موقع کے لحاظ سے حکومت یا مرکزی بنیک اس تناسب میں کمی بیشی قانوناً لازمی قرار دے جو امانتوں اور نقد سرمائے کے درمیان بنیک عام طور پر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا اثر فوری ہوگا، اور اچانک کمی یا زیادتی روز روز نہیں کرائی جا سکتی کیونکہ اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اگر مرکزی بنیک کو یہ اندیشہ ہو کہ عام بنیکوں کے پاس فاضل زر محفوظ ہے، اور وہ افراط زر کے حالات پیدا کر سکتی ہیں تو اس فاضل زر کے اثر کو ختم کرنے کا ایک بہت ہی موثر طریقہ یہ ہوگا کہ بنیک زر محفوظ کے تناسب میں اضافہ کر دے۔

زر کی مقدار میں ردوبدل یا اس طرح کے دوسرے طریقوں کی مدد سے معاشی مدوجزر کا علاج ممکن ہے یا نہیں۔ اس کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ پچھلے سالوں کا تجربہ شاہد ہے کہ معاشی مدوجزر سے ہمیں نجات نہیں مل سکی ہے۔

زر کا انتظام کرنے والوں کے ہاتھ میں جو ہتھیار موجود ہیں اُن سے کام لیکر اس سلسلہ میں کوئی قطعی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ " قیمتوں اور کاروبار کی مقدار کے تعین پر کام کرنے والے اور بھی اثرات ہیں جو اتنے ہی یا اس سے زیادہ طاقتور ہیں جتنا زر کی مقدار۔ ان میں سے بہت سے زر سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے اور اس لئے زر کے ذریعہ ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ کاروبار کی مقدار پر ان کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ زر کی موجودہ مقدار کی گردش کا زور بڑھ یا گھٹ جائے، اور یہ بھی کہ زر کی مقدار میں از خود اضافہ ہو جائے۔ فیڈرل رزرو سسٹم (مرکزی بنیک) کو شرح سود پر جو قابو حاصل ہے کاروبار کی مقدار کے تعین میں اس کا بڑا اثر پڑ سکتا ہے، لیکن دوسرے ایسے اثرات بھی ہیں جو اسے بالکل ختم کر دے سکتے ہیں۔"

کساد بازاری کے دنوں میں زر کے ذریعہ جو نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں وہ بہت معمولی ہیں، کیونکہ ایسی صورت میں زر کی مقدار میں اضافے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس وقت تو خود بینکوں کے پاس کافی مقدار میں فاضل رقمیں موجود ہوتی ہیں اور مصیبت یہ ہوتی ہے کہ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ مرکزی بنیک کسی کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ سرمایہ کاری میں روپیہ لگائے۔ شرح سود پر ضرور اس کا قابو ہوتا ہے، لیکن شرح سود سب کچھ نہیں، اصل تو یہ ہے کہ نئی مشینوں کی خرید سے کتنی آمدنی یا نفع کی امید ہے، اس امید اور شرح سود کا رشتہ یہ طے کرتا ہے کہ کتنی سرمایہ کاری ہوگی۔ محض شرح سود میں تبدیلی سے نفع کے متعلق اندازوں پر فیصلہ کن اثر نہیں پڑتا۔ خوشحالی کے دنوں میں ہی مرکزی

بنیک زر کی مقدار میں کمی کرنے میں کچھ کامیاب ہوسکتا ہے کیونکہ اس وقت ڈھیرے ڈھیرے بینکوں کے پاس جو فاضل رقمیں ہوتی ہیں وہ کام میں آچکی ہوتی ہیں، لیکن معاشی استحکام کا مقصد اس سے پورا ہو نہ ہو، قبل اس کے کہ مرکزی بینک قرض کے سلسلے میں کام آنے والی رقمیں کم کرنا شروع کرے، ہوسکتا ہے کہ صورت حال کافی بگڑ چکی ہو۔ جیسا کہ پروفیسر ہینسن نے کہا ہے "محض زر کی پالیسی پر بھروسہ کرنا کہ اس سے افراط زر کے رجحانات کو قابو میں کیا جا سکتا ہے بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کوشش بہت ہی بڑے پیمانے پر ہو تو البتہ یہ کامیاب ہوسکتی ہے، لیکن یہ کامیابی ایسی ہوگی کہ سارا معاشی نظام بالکل چاروں خانے چیت ہوگا۔" علاج ایک ہی ہے بہت شدید قسم کا آپریشن، لیکن اس اپریشن کا نتیجہ محض یہ نہیں ہوگا کہ خوش حالی افراط زر میں نہ بدلے، بلکہ اس کے بدلے میں کساد بازاری ناگزیر ہو جائے گی۔" معاشی استحکام کا مقصد زر کی پالیسی کے ذریعہ ہی نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زر کی پالیسی اور حکومت کے دوسرے اقدامات میں جن کا مقصد کاروبار کی مقدار کو متاثر کرنا ہوتا ہے تطابق ہونا چاہیے۔"

نظریۂ مقدار پر اب پرانا اعتقاد باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن پچھلی وفاداری کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے، اور اس رائے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ قیمتوں میں تبدیلیوں کا باعث زر کی مقدار میں ردوبدل ہی ہوتا ہے بقول پروفیسر ہینسن "اس رائے میں بہت خفیف سی سچائی ہے۔" کچھ اس عنصر کا دخل ہے کہ زر اور قیمتوں کے تعلق کو بہت سیدھا سادہ بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

بنیادی طور پر یہ رائے بالکل غلط ہے، یہ کہنا کچھ زیادہ صحیح ہوگا کہ قیمتوں کا دارومدار مجموعی خرچ، یا مجموعی طلب پر ہوتا ہے، لیکن یہ بھی پورا سچ نہیں، کیونکہ اس جملے میں وہ مختلف رشتے، یا معاشی تعلقات جو زر کی مقدار اور قیمتوں کے درمیان کام کرتے ہیں شامل نہیں۔ افراطِ زر، یا زر کی مقدار میں کمی، دوسرے الفاظ میں غیر مستحکم خوش حالی اور کساد بازاری کا علاج کرنے کی صورت یہ ہے کہ مجموعی خرچ کی مقدار کو قابو میں رکھا جائے، اور یہ مقصد محض زر کے ردوبدل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ خوش حالی کو کساد بازاری سے بدل دینے کی ذمہ داری اس پر ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کی بدولت ہوتا یہ ہے کہ قومی آمدنی کا بڑا حصہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے جو "خرچ" کم کرتے ہیں۔ بچاتے زیادہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام استعمال کی چیزوں کی مانگ کم ہو جاتی ہے، اور اس طرح کساد بازاری کا آغاز ہوتا ہے جیسا کہ آرتھر گیئر نے کہا ہے امریکہ سے پچھلی عالمگیر کساد بازاری کا آغاز یوں ہی ہوا کہ لوگوں کی قوتِ خرید پیداوار میں اضافے کا ساتھ نہ دے سکی، چیزوں کی بکری رک گئی، اور تقریباً ساری دنیا کساد بازاری کا شکار ہو گئی۔ اس صورتِ حال کا علاج ظاہر ہے یہ ہے کہ قوتِ خرید میں کمی ہونے نہ دی جائے۔ یہ کام ظاہر ہے زر کی مقدار میں اضافے یا کمی سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے دوسرے ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ایسا معاشی نظام تعمیر کیا جائے جس میں عام لوگوں کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، پروفیسر کول اور اُن کے ساتھ بائیں بازو کے بہت سے

مصنفین کی جو کینس کے پرستار ہیں یہ رائے ہے کہ موجود تقسیم دولت کے
ڈھانچے کو بدل کر یہ مقصد حل ہو سکتا ہے۔ وہ موجودہ نظام کو یکسر بدلنے کے
بارے میں کچھ ایسے سرگرم نہیں۔

سرمایہ داری کے حامی، نیم حامی سمجھتے ہیں کہ کساد بازاری کا علاج اس طرح
ہو سکتا ہے کہ حکومت مجموعی خرچ کی مقدار کی کمی بیشی پوری کرتی رہے۔ اگر
حکومت یہ دیکھے کہ افراد کی سرمایہ کاری اور عام استعمال کی چیزوں کی خرید سے
مجموعی خرچ اس سے کم ہوتا ہے جو "مکمل روزگار" کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے
ضروری ہے تو وہ اس کمی کو پورا کر دے، اگر یہ دیکھے کہ یہ رقم ضرورت سے زیادہ ہے
تو اس خرچ میں کمی کر دے۔ اس مقصد کے لئے محصول لگانا یا کم کرنا ہوگا، قرض
لینا، یا واپس کرنا ہوگا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی کافی ہوگا، بعض کا خیال ہے،
مثلاً پروفیسر ہینسن، کہ حکومت کو بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔ پہلی
رائے کے حامیوں کو تو کہیں جھلا دیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر ان کے نسخے پر عمل
کر کے معاشی استحکام کی کیفیت حاصل ہو سکتی تو سرمایہ داری کی یہ خصوصیت
کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ رہا حکومت کی طرف سے سرمایہ کاری کا بڑے پیمانے
پر پروگرام پروفیسر ہینسن کا کہنا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کی بہت سی خرابیاں
یوں ہی دور ہو سکتی ہیں کہ حکومت بذات خود سرمایہ کاری کے ذریعہ انہیں دور
کر دے، مثلاً مزدوروں کیلئے اچھے، صاف مکانات کی تعمیر، مزدور بستیوں
کی جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے دامن پر ایک دھبہ ہیں تجدید، وغیرہ۔
لیکن ان مقاصد کیلئے پیسے کون دیگا؟ وہ لوگ جن کی بدولت یہ موجود ہیں

آئی ہیں ؟ کساد بازاری کے علاج کے لئے حکومت اگر اس طرح کے کام کرے گی تو سرمایہ دار چیخ اٹھیں گے کہ حکومت فضول خرچی کر رہی ہے، جو تھوڑی بہت سرمایہ کاری انفرادی طور پر سرمایہ دار کر رہے ہوں گے اس میں بھی کمی ہو جائے تو تعجب نہیں کیونکہ ان اخراجات کے نفسیاتی اثرات بُرے ہوں گے، پروفیسر مارس ڈاب کا کہنا ہے کہ موجودہ سرمایہ دار حکومتیں صرف ایک ہی مقصد کے لئے پیسے خرچ کریں تو تھوڑی بہت نجات ممکن ہے، اور وہ یہ ہے کہ لڑائی کی تیاریوں پر بڑے پیمانے پر پیسے صرف کئے جائیں۔ امریکی حکومت دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اپنے ہاں کساد بازاری سے بچنے کی جو صورتیں کر رہی ہے اُس میں ان اخراجات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ علاج کسی نہ کسی دن لاکھوں انسانوں کی موت کا باعث ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا روٹی کے سوال کا حل بجز اس کے کہ موت سے کیا جائے کسی اور طرح حل نہیں ہو سکتا ؟ دنیا کے بعض ملکوں نے امن کے راستے پر چل کر اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے دشمنوں کی شہادت یہ ہے کہ یہ کوششیں بہت کامیاب ہیں۔ روس نے انقلاب کے بعد سے جتنی تیز رفتاری سے ترقی کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ اور اب سے پچیس تیس سال پہلے روس ویسا ہی پس ماندہ غیر ترقی یافتہ ملک تھا جیسا آج ہندوستان ہے !

آٹھواں باب۔ بیرونی زر

تمہید

زر سے متعلق مسائل کا ایک اور بھی اہم پہلو ہے۔ زر سے لین دین کے کام میں سہولت ہوتی ہے۔ اب تک ہم جن مسائل سے بحث کر رہے تھے وہ زر کے ایک پہلو سے تعلق رکھتے ہیں، اس ساری گفتگو میں ہم نے یہ فرض کر لیا تھا کہ زر سارے ملک میں گردش کرتا ہے اور بیرونی تجارت یا لین دین کے سوالات سے بحث نہیں کی گئی تھی، لیکن بیرونی تجارت اپنی جگہ پر بہت اہم ہوتی ہے، اور کم ایسے ملک ہیں جو دوسرے ملکوں سے لین دین نہ کرتے ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں قدرتی ذرائع یا فنی معلومات میں اختلاف کی بدولت مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں، ان میں بعض چیزیں ایک ملک میں آسانی سے اور کم لاگت پر تیار ہو سکتی ہیں بعض کسی اور ملک میں۔ اس لئے ہر ملک کے لئے یہ نفع کی صورت ہوتی ہے کہ وہ چیزیں خود تیار کرے جن کی لاگت اس ملک میں کم ہو، اور پھر اُن چیزوں کی مدد سے باہر کے ملکوں سے دوسری ضرورت کی چیزیں منگائے جو خود بنانے میں اسے زیادہ لاگت لگانی پڑتی۔ موٹے لفظوں میں بین الاقوامی تجارت کا بنیادی اصول یہی ہے، لیکن یہ اصول صرف بین الاقوامی

لین دین میں ہی کام نہیں کرتا۔ ملک کے اندر مختلف جغرافیائی علاقوں میں بھی اسی اصول کی بنیاد پر تقسیم عمل ہو سکتی اور ہوتی ہے مختلف افراد اسی اصول کے پیش نظر مختلف پیشے اختیار کرتے ہیں، اور پھر اپنی یا تنخواہ کی مدد سے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مبادلے، یا باہمی لین دین کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ہر آدمی، یا ملک اپنی ضرورت کی سبھی چیزیں تیار نہیں کر سکتا اور اسے اس میں فائدہ ہوتا ہے کہ وہ کام چن لے جس کے لئے وہ زیادہ موزوں ہو، اور پھر اپنی ضرورت کے پورے کرنے میں دوسروں سے مدد لے، اور دوسروں کی اپنی اس صلاحیت کے ذریعے سے مدد کرے۔

جب تجارت کا باہمی لین دین کا بنیادی اصول ایک ہی ہے، چاہے یہ لین دین ایک ملک کے دو حصوں کے درمیان ہو، یا دو افراد کے درمیان، یا دو ملکوں میں تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بیرونی زر کے مسائل پر الگ سے بحث کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ جن اصولوں کی مدد سے ہم کسی ملک کے اندر زر کی کارکردگی کی توضیح کر سکتے ہیں ہی اصول اس کی بین الاقوامی کارکردگی کی بھی توضیح کر سکیں گے، کسی ملک کے اندر حکومت جو بھی سکہ سرکاری طور پر منظور کرلے چل جاتا ہے، اس ملک کے اندر رہنے والے سب لوگ چیزوں کی خرید و فروخت، یا قرض کی لین دین میں اس زر کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن دو ملکوں کے اندر یہ لازمی نہیں کہ ایک ہی سکہ کام کرتا ہو۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد کچھ عرصے تک ہند و پاکستان میں

ہندوستان کے ہی سکے رائج تھے، لیکن اب حکومت پاکستان نے اپنے الگ سکے رائج کر لئے ہیں۔ اسی طرح ہر ملک کی کرنسی اپنی الگ ہوتی ہے۔ انگلستان میں پونڈ، شلنگ، پنیس، امریکہ میں ڈالر اور پنیس سکوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں کام نہیں آتا۔ اسکی بڑی وجہ کھلی ہوئی یہ ہے کہ زر کی اہمیت اس کی قوتِ خرید کی بدولت ہوتی ہے، جہاں تک ایک ملک کے سکے کا سوال ہے، دوسرے کسی ملک میں اس کی کوئی بھی قوتِ خرید نہیں ہوتی۔ ڈالر کی مدد سے ہم دہلی میں کچھ بھی نہیں خرید سکتے۔ روپیہ نیو یارک میں کوئی کوڑیوں کے دام بھی نہیں پوچھے گا۔ بین الاقوامی لین دین میں کسی ایسے سکے کی غیر موجودگی کی بدولت جو سبھی ملکوں میں رائج ہو کچھ خاص قسم کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان سوالات کے بدولت ہی بیرونی زر پر الگ بحث ضروری ہو جاتی ہے۔ بین الاقوامی لین دین پر کم سے کم عارضی طور پر محض زر کی بدولت کچھ ایسے اثرات پڑ سکتے ہیں جو ممکن ہے تجارت کے بنیادی اصول سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

جب دو ملکوں میں ایک ہی سکہ کام نہ کرتا ہو تو آپس میں لین دین کی صورت ایک ہی رہ جاتی ہے۔ کسی طرح ان کے سکے بدلنے کا انتظام ہو جائے۔ مثلاً اگر بمبئی میں کوئی امریکہ یا انگلستان سے موٹریں منگوائے تو یہ سودا اس طرح آسانی سے ہو سکے گا کہ بمبئی کا خریدار جو موٹریں درآمد کر رہا ہو وہ موٹروں کی قیمت کسی طرح ڈالر اور پونڈ میں ادا کر دے، اسی طرح اگر کسی امریکی یا انگریز تاجر کو ہندوستان سے کوئی چیز منگانی ہو تو اُسے اس کا انتظام کرنا ہوتا ہے کہ وہ اُس کی قیمت کی ادائگی میں روپے دیدے

باہمی لین دین کے لئے دو ملکوں کو یہ انتظام کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے سکّے بدل لیں، اوپر کی مثال میں انگریز یا امریکن تاجر موٹروں کی قیمت کی ادائگی کے لئے ہندوستانی تاجر کو پونڈ یا ڈالر حاصل کرنے ہونگے ان کے حصول کی صورت ایک ہی ہے۔ وہ کسی طرح اپنے روپیوں کو ڈالر کی یا پونڈ کی شکل میں بدلوا لے۔ انگلستان یا امریکہ اور ہندوستان میں تجارت یک طرفہ نہیں ہوگی، یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم امریکہ یا انگلستان سے چیزیں خریدیں، اور خود وہاں کچھ نہ بھیجیں کیونکہ اس صورت میں ان چیزوں کے دام ادا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔ تجارت چونکہ دو طرفہ ہوتی ہے، اس لئے ہوگا یہ کہ کچھ ہندوستانی تاجروں کو انگلستان اور امریکہ سے سکّے حاصل کرنے ہوں گے کیونکہ انھوں نے کچھ چیزیں برآمد کی ہوں گی، اور کچھ کو درآمد کی ہوئی چیزوں کی قیمت کی ادائگی کے لئے ڈالر اور پونڈ کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ ان چیزوں کی قیمت اس سکے میں دے سکیں جو ان کے بھیجنے والے قبول کرلیں۔ ہندوستان میں اس طرح کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو روپیے کے عوض ڈالر یا پونڈ حاصل کرنا چاہتے ہوں گے، انگلستان اور امریکہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو پونڈ یا ڈالر کے بدلے میں روپے حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔ انھیں کسی طرح یکجا کردیا جائے تو ادائگی کی صورت نکل آئے گی۔

مختلف سکّوں کے خریداروں اور بیچنے والوں کو یکجا کرنے کا ادارہ وہ بازار ہوتا ہے جس میں مختلف ملکوں کے سکّوں کی لین دین ہوتی ہے سکوں کی لین دین میں لازمی طور پر کم سے کم دو پارٹیاں ہوتی ہیں۔

کوئی انگریز تاجر جسے روپیوں کی ضرورت ہو، اور کوئی ہندوستانی تاجر جسے اتنی ہی رقم پونڈ کی شکل میں درکار ہو۔ اس سے ایک سبق یہ نکلتا ہے کہ کسی ملک کو باہر سے جتنی رقم دوسرے ملکوں کے سکوں کی شکل میں ملنے والی ہو، اتنی ہی رقم اسے اپنے سکے کی شکل میں ادا بھی کرنی چاہئے۔ جتنے روپے ہمیں باہر سے ملنے والے ہوں، ہمیں اتنے ہی کے برابر ڈالر اور دوسرے سکے دوسرے ملکوں کو ادا کرنا چاہئے ورنہ آپس کی لین دین ناممکن ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر ہم دس ڈالر کی قیمت کی چیزیں باہر سے منگائیں اور ایک ڈالر ایک روپے کے برابر ہو تو ہمیں دس روپے کی چیزیں باہر بھیجنا چاہئیں ورنہ ہمیں ڈالر کی ضرورت ہوگی اور ہم اسے پوری صرف اس طرح کر سکیں گے کہ ایک ڈالر کے بدلے میں زیادہ روپے دیں۔ لیکن ان مسائل سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ فی الحال ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیرونی زر کے سلسلے میں سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف سکوں کی لین دین برابر ہو۔

مختلف سکوں کی باہمی لین دین کی کیا صورت ہوتی ہے۔ یہ تو ہم نے ابھی کہا ہے کہ قبل اس کے کہ ہندوستان سے انگلستان یا امریکہ کو کوئی رقم ادا کی جا سکے یہ ضروری ہوتا ہے کہ انگلستان یا امریکہ کے کسی ایسے تاجر کو ڈھونڈھ نکالا جائے جو ہندوستان میں کسی کو اتنی ہی رقم دینا چاہتا ہو، ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے تو لین دین میں پھر کوئی دقت باقی نہیں رہ جاتی۔ بیرونی زر کے بازار میں مختلف ممالک کے سکے خریدے اور

بیچے جاتے ہیں۔ اس بازار کی کردگی کے متعلق ہمیں کچھ جان لینا چاہیئے۔ یہ بازار معمولی بنئے کی دکان یا اسٹور کی طرح کام نہیں کرتے جہاں خریدار اور بیچنے والے کا سامنے آنا ضروری ہے۔ بلکہ غیر ملکی سکوں کا بازار کسی ایک ملک کی حدوں کا بھی پابند نہیں۔ رسل و رسائل کے موجودہ ذرائع کی بدولت اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دنیا بھر کے وہ مرکز جہاں بیرونی زر کی لین دین کا کاروبار ہوتا ہے ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہو جائیں۔ اس بازار میں لین دین ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لندن میں بیرونی زر کا کاروبار کرنے والا بنیکر اتنی ہی آمادگی سے نیویارک یا پیرس کے کسی بنیکر سے جو یہی کاروبار کرتا ہو لین دین کے لئے تیار ہو جائے گا جیسے وہ دوسری سڑک پر اپنے ملک کے اندر ہی کسی بنیکر سے کرے گا۔ ترقی یافتہ ممالک میں عام طور پر لین دین میں چاپ کے ذریعہ کام چلتا ہے، اور چاپ کی اہمیت ہم جانتے ہیں محض اس لئے ہوتی ہے کہ اس کی پشت پر بینک میں رکھی ہوئی امانتیں ہوتی ہیں۔ بیرونی زر کے بازار میں بھی لین دین اسی طرح مختلف ملکوں میں بنکوں کے پاس رکھی ہوئی امانتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بیرونی زر کے بازار کا کام یہ ہے کہ مثلاً ہندوستان کے بنکوں کی کسی متعین امانت کو انگلستان یا امریکہ کے کسی بنک کی امانت سے بدل دے۔ یہ ظاہر ہے کہ انگلستان میں بنکوں کے پاس جو امانتیں ہوں گی وہ پونڈ کی شکل میں ہوں گی، ہندوستان میں روپے کی شکل میں۔ بیرونی زر کی لین دین میں خریدار اور "دوکاندار" دونوں ہی روپیہ خریدتے اور بیچتے ہیں اس لئے دونوں ہی طرف سے

ادائگی چیک کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مثلاً جب ایک ہزار پونڈ چار ہزار ڈالر کے عوض فروخت ہوتے ہیں تو پونڈ مہیا کرنے والا تاجر ایک ہزار پونڈ کا چیک اپنے بینک کے نام لکھ کر دیتا ہے۔ بدلے میں اسے چار ہزار ڈالر کا ایک چیک ملتا ہے جو نیویارک یا امریکہ کے کسی اور شہر میں کسی بینک کے نام ہوتا ہے۔ اس طرح جو لین دین ہوتی ہے وہ بھی اب بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چیک دینے کے بجائے ڈالر بھیجنے والا تاجر اپنے بینک کو (نیویارک میں یا کہیں اور) تار سے یہ ہدایت بھیج دیتا ہے کہ چار ہزار ڈالر خریدار کو یا اس کی ہدایت کے مطابق کسی اور کو ادا کر دے۔ دستخط کے بجائے کوئی خفیہ اصطلاح کام میں آتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے یہ لین دین "بل آف ایکسچینج" ہم اسے بیرونی ہنڈی کہہ سکتے ہیں۔ آئندہ ہم اسے محض بل کہیں گے ــــ کے ذریعہ ہوتی تھی۔ یہ بل دراصل اس لئے کام میں آتے تھے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو روپیہ بھیجنے کی ضرورت ہی ختم کر دی جائے۔ بل کی کارکردگی کا طریقہ سمجھنے کے لئے یہ مثال مفید ہوگی، فرض کیجیے بلفاسٹ کا ایک تاجر میکڈرموٹ نیویارک میں براؤن نامی تاجر کے ہاتھ کچھ کپڑا بیچتا ہے۔ اس کی قیمت ایک ہزار پونڈ ہے۔ اب اس ایک ہزار پونڈ کی وصولی کا طریقہ یہ ہوگا کہ میکڈرموٹ براؤن کے نام ایک بل بھیجے گا جس میں یہ ہدایت ہوگی کہ "بل ملنے کے نوے دن بعد" براؤن ایک ہزار پونڈ کی رقم خود میکڈرموٹ کو یا کسی اور کو جو یہ بل اس کے پاس لے کر آئے ادا کر دے۔

یہ بل براؤن کے پاس پہونچتا تو وہ اسے منظور کر لیتا اور اس پر دستخط کر دیتا اور اسے میکڈرموٹ کے پاس واپس بھیج دیتا۔ اسی وقت یہ ہو سکتا ہے کہ لور پول کا ایک تاجر جولسن، جس نے نیویارک کے ایک تاجر اسمتھ سے روئی منگائی ہے اسمتھ کو ایک ہزار پونڈ دینا چاہتا ہے، میکڈرموٹ اگر اپنا بل جولسن کے ہاتھ بیچ دے تو اسے ایک ہزار پونڈ مل جائیں گے، اُدھر جولسن بھی بل اسمتھ کے پاس بھیج دے تو وہ ایک ہزار پونڈ براؤن سے وصول کر لیگا۔ اس طرح دونوں سودے مکمل ہو گئے اور یہ ضروری نہیں ہوا کہ روپیہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بھیجا جائے۔ لیکن بل کی کارکردگی کی یہ تصویر غیر مکمل ہے۔ اوپر کی مثال میں بل براؤن کے نام ... براؤن نیویارک کا ایک غیر معروف تاجر ہے، اس کے نام کا بل ... اس لئے ہوتا یہ تھا کہ بل "منظور" کرنے کا کام ایسے ادارے ... تے تھے جن کی شہرت اور اہمیت بہت معلوم و مشہور ہو۔ مثلاً اس مثال میں براؤن نیویارک کے کسی اہم بنک سے یہ طے کر سکتا ہے کہ بینک اس کے نام کا بل منظور کر لے۔ اور پھر وہ میکڈرموٹ کو یہ لکھ بھیجتا کہ بل بجائے براؤں کے اس بنک کے نام بھیجو۔ یا پھر وہ یہی انتظام لندن کے کسی بنک سے کر سکتا ہے، دراصل ہوتا یہی تھا۔ جو بل پونڈ میں ہوتے وہ انگریزی بنک "منظور" کرتے تھے چاہے اس کی ادائگی کرنے والا انگریز ہو یا نہ ہو (ہماری تجارت بھی ایسے ہی بلوں کے ذریعہ ہوتی تھی جو پونڈ میں ہوتے تھے) اسی طرح جو بل ڈالر میں ہوتے، نہیں امریکن بنک منظور کرتے تھے۔ بنک یا دہ ادارے جو بل "منظور" کرتے تھے روپیہ لازمی طور پر

قرض نہیں دیتے تھے۔ سمجھوتہ یہ ہوتا تھا کہ (ہماری مثال میں) براؤن بل کی ادائگی کا وقت آنے سے پہلے بنیک کو روپے دیدے گا۔ اس طرح کے اداروں یا بنیک کا کام یہ تھا کہ وہ مقروض کی ایمانداری کی شہادت دیدیں تاکہ اس کے قرض کا دستاویز بازار میں بک سکے۔

اس شہادت کے بعد اس عہدنامے کو اتنی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے کہ قرض کی لین دین اسے ضمانت کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں بنیک اپنے سرمائے کا کچھ حصہ مختلف قسم کی دستاویزوں کے خریدنے میں لگاتی ہیں۔ بل اس مقصد کے لئے بہت موزوں ہوتا ہے۔ کیونکہ تین مہینے یا اس سے کم میں اس کی رقم مل جاتی ہے ... سے زیادہ دنوں تک بنیک کی رقم پھنسی نہیں رہتی۔ یہ کام محفوظ ... ہے کہ اس دستاویز پر کسی بہت مشہور بنیک کی ضمانت کا ذمہ ہے اس لئے اس سے قطع نظر کہ ان کے ذریعہ بین الاقوامی لین دین میں مدد ملتی ہے بل کی مانگ اس لئے بھی ہوتی ہے کہ اس میں روپیہ لگانا خاصا نفع کا سودا ہوتا ہے۔

ہماری مثال میں بجائے اس کے کہ میکڈرموٹ بل جولسن کے ہاتھ بیچے اس بل کو وہ مڈلینڈ بنیک کے ہاتھ بیچ سکتا ہے، جولسن جب بل خریدے گا تو اس کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بل ایسا ہو جس کی رقم کی ادائگی کا وقت بہت قریب ہو، ورنہ اسمتھ کو بل کے ملنے کے بعد بھی کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا۔ وہ میکڈرموٹ کا بل خریدے، اس کے برخلاف مڈلینڈ بینک نے مختلف تاریخوں میں ادائگی کے مختلف بل

خرید رکھے ہوں گے، وہ میکڈرموٹ کا بل بھی خرید لیگا، اور اس طرح میکڈرموٹ کو اپنے کپڑے کے دام اس سے پہلے مل جائیں گے جب براؤن یہ دام ادا کرے گا۔ اس خدمت کے صلے میں بنیک اور دوسرے ادارے کچھ سود کما لیتے ہیں، کیونکہ وہ تھوڑا بہت روپیہ قرض دیتے ہیں۔ لیکن اس طریقے سے بین الاقوامی لین دین اب بہت ہی تھوڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ اب تو بیرونی زر کی لین دین کا کام وہ تاجر یا بنیکر کرتے ہیں جو مختلف ملکوں کے سکے ہی خریدتے اور بیچتے ہیں۔ اس تجارت کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں بنیکوں میں آپ کے پاس کافی سرمایہ موجود ہو۔ یہ کام اسی لئے بڑے بڑے بنیک کرتے ہیں۔ سرمایہ کی بہتات کے شرط اولین ہونے ہی کی وجہ سے ایک ہندوستانی بنیک یہ کاروبار کامیابی سے نہیں کر سکا ہے۔ ہمارے ہاں بیرونی تجارت کی مالی ضروریات پورا کرنے کا کام اکسچینج بنیک کرتے ہیں جن میں سے ایک بھی ہندوستانی نہیں۔ ان بنیکوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی تاجروں کو وہی سہولتیں نہیں دیتے جو بیرونی تاجروں کو دیتے ہیں۔ اس لئے بارہا یہ تجویزیں بنی ہیں کہ کوئی ہندوستانی بنیک یہ کام شروع کرے۔ ابھی تک یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ دو ایک بنیک جو قائم کئے گئے ہیں انہیں بیرونی بنیکوں کے مقابلے نے کاروبار بند کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اب ایک آدھ بنیک دوسرے کاروبار کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت یہ کام بھی کرتے ہیں، قبل اس کے کہ ہم یہ حصہ ختم کریں یہ بتانا ضروری ہے کہ مختلف ملکوں کے

سکّے خریدنے اور بیچنے میں کون سا اصول مدِ نظر رکھتے ہیں۔ کوئی دکان دار اپنے مکان میں سامان اسٹاک کرنے اور اسٹاک کے خالی ہونے میں یہ بات ذہن میں رکھتا ہے کہ خریداری کی رفتار یا مال کی نکاسی کی کیا حالت ہے۔ اور اگر مال تیزی سے نکل رہا ہو تو وہ اتنی ہی تیزی سے دکان میں اسٹاک بڑھانے کی بھی کوشش کرے گا، اگر مال کی نکاسی کی حالت اچھی نہ ہو تو وہ نیا مال خرید کر اسٹاک کرنے کے معاملے میں احتیاط سے کام لیگا۔ کیونکہ مال خرید کر رکھے رہنے میں رقم بیکار پھنسی رہتی ہے۔ اسی طرح یہ بینک بھی مختلف سکّوں کی خرید و فروخت ان سکّوں کی مانگ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اگر بینک یہ دیکھتا ہے کہ کسی سکّے کی مانگ کم ہے۔ اور جتنا اس نے خرید لیا ہے وہ آسانی سے نہیں نکلتا تو اس سکّے کی خریداری میں کمی کر دیگا اس کے برخلاف اگر وہ دیکھے گا کہ اس کے خریدے ہوئے سکّوں کی نکاسی کی رفتار تیز ہے، اور مختلف ملکوں کا اسٹاک بہت کم ہوتا جا رہا ہے تو وہ بازار سے خود سکّے خرید کر انھیں اسٹاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ عام اصول یہ ہے کہ بینک ہر روز اور کبھی کبھی اس سے بھی کم عرصے میں یہ حساب لگاتے رہتے ہیں کہ مختلف ملکوں کے سکّوں کے ۔ جس کا ظاہر ہے یہ مطلب ہے کہ مختلف ملکوں کے بینکوں کے پاس ان کی امانت کے ۔ ذخیرہ کا کیا حال ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی سکّے کی مانگ اس کی رسد سے زیادہ ہے تو وہ یہ کوشش نہیں کرتے کہ اپنے ذخیرے سے اس کمی کو پورا کر دیں کیونکہ اس صورت میں خود ان کے لئے آئندہ اس سکّے کا

حصول مشکل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی سکے کی رسد مانگ سے زیادہ ہو تو وہ اس کو خرید کر اس کا ذخیرہ نہیں بناتے کیونکہ اس صورت میں ان کے لیے اس سکے کی نکاسی میں دشواریاں ہو سکتی ہیں۔ جب بیرونی زر کے بازار پر کسی طرح کی پابندی نہ ہو، تو اس لین دین کا انداز یہ ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا، اس صورت میں سکوں کی طلب و رسد کا سکوں کی باہمی قیمت کے تعین میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن آج کل بیرونی زر کے بازار کو یہ آزادی کہیں بھی حاصل نہیں۔ لیکن ان سوالات سے ہم آئندہ بحث کریں گے۔

۲۔ بیرونی زر کی طلب و رسد سے قیمتوں کا تعین

ہم نے بیرونی زر کے بازار کا ذکر کیا ہے، اس کی کارکردگی کا طریقہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ مختلف سکوں کی باہمی قیمت کا تعین کیونکر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ ایک روپیہ اور ڈالر کی باہمی قیمت کیسے طے ہوتی ہے، پونڈ اور فرانک کی باہمی قیمت کا تعین کیونکر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے قیمتوں کے تصور کی وضاحت ضروری ہے۔ قیمتوں کی مدد سے ہم یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک روپے یا ایک آنے میں ایک چیز اتنی گنتی یا مقدار میں مل سکتی ہے۔ اس لیے پونڈ یا روپے کی باہمی قیمت کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں ایک روپے میں

اتنی چیزیں مل سکتی ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کے مقابلے میں زر کی قوتِ خرید یہ ہے یا دوسرے الفاظ میں اتنی چیز زر کے عوض مل سکتی ہے۔ اسی طرح جب روپے اور ڈالر کی باہمی قیمت کا ذکر ہو تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ڈالر کتنے روپیوں کے عوض میں مل سکتا ہے یا ایک ڈالر کی قیمت روپوں میں یہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس وقت ایک ڈالر کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں چار روپے دینے پڑیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک روپے کی قیمت ۲۵ سنٹ ہے، یعنی ایک روپیہ دیکر ہم ۲۵ سینٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں ایک ڈالر کی قیمت چار روپے ہیں۔

قیمتوں کے تعین کا عام اصول یہ ہے کہ اس کا انحصار طلب اور رسد پر ہوتا ہے۔ اگر قیمت میں اضافہ ہو جائے تو مانگ کم ہو جاتی ہے اور رسد میں اضافہ ہوتا ہے، اگر قیمت میں کمی ہو جائے، تو مانگ بڑھتی ہے اور رسد میں کمی ہو جاتی ہے اس طرح قیمت میں اس وقت تک ردوبدل ہوتا رہے گا جب تک کسی دام پر طلب اور رسد دونوں برابر نہ ہو جائیں۔ جس دام پر بھی طلب اور رسد میں توازن پیدا ہو جائے بازار میں وہی دام رائج رہے گا، یہاں تک کہ طلب یا رسد میں کسی اور وجہ سے کوئی تبدیلی نہ ہو جائے۔ بیرونی زر کی قیمت کا تعین اس اصول کے ہی مطابق ہوتا ہے۔ عام حالات میں بیرونی زر کی جو مقدار کسی ملک کے رہنے والے خریدنے کو تیار ہوں گے اس کا دارومدار اس پر ہوگا کہ ملکی سکے کے مقابلے میں بیرونی سکوں کے دام کم ہیں یا زیادہ۔ دام کم ہوئے، یعنی اگر اپنے سکے کم تعداد میں دیکر دوسرے ملک کے زیادہ سکے حاصل کئے جا سکیں گے تو

بیرونی سکوں کی مانگ زیادہ ہوگی، اگر دام زیادہ ہو تو مانگ کم ہوگی مختلف ملکوں میں مختلف چیزوں کے دام میں اگر کوئی تبدیلی نہ ہو تو کسی بیرونی سکے کی قیمت میں کمی سے اس ملک کی سب چیزیں سستی ہو جائیں گی، اور اس لئے باہر سے درآمد بڑھ جائے گی، اب اس درآمد کا دام چکانے کے لئے اس ملک کے روپے کی مانگ بڑھ جائے گی، اس کے برخلاف اگر کسی بیرونی سکے کے دام میں اضافہ ہو جائے تو اس ملک کی سب چیزیں مہنگی ہو جائیں گی، اس لئے درآمد کم ہو جائے گی، اور جب درآمد کم ہو تو اس سکے کی مانگ بھی لازماً کم ہوگی۔

بیرونی زر کی مانگ اور رسد کی مزید توضیح کی ضرورت ہے۔ کوئی شخص جس کے پاس پونڈ موجود ہوں اگر ان کے عوض میں روپے چاہتا ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ روپے کا خریدار ہے، اور پونڈ کا دکان دار۔ اسی طرح اگر کوئی روپے کے عوض پونڈ حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ روپیہ بیچ رہا ہے اور پونڈ خریدنا چاہتا ہے سیکڑوں افراد کی مانگ، اور ان کے مہیا ہوئے زر کی مقدار، بیرونی زر کے بازار میں سکوں کی مجموعی طلب اور رسد کا تعین کرتی ہے اور اس طلب و رسد کے توازن سے قیمتیں طے ہوتی ہیں جب تک کسی بیرونی سکے کی مانگ زیادہ ہوگی اور رسد کم اس کی قیمت زیادہ ہوگی، یعنی اسکے معاوضے میں اپنے ملک کے زیادہ سکے دینے ہوں گے لیکن بیرونی سکے کی مانگ کیوں ہوتی ہے۔ ایک مقصد کا ذکر تو بار بار ہو چکا ہے اور وہ ہے چیزوں کی خرید و فروخت۔

مختلف ملک ایک دوسرے سے مختلف چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں، اور ان چیزوں کا دام چکانے کے لیے انھیں ایک دوسرے کے زر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بیرونی زر کی ضرورت محض اسی لیے نہیں ہوتی۔ ان ضرورتوں کو تین موٹی موٹی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک تو زر کی وہ مانگ جو چیزوں کی خرید و فروخت کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے بیرونی زر کی مانگ اس لیے بھی ہوتی ہے کہ بعض صورتوں میں بیرونی ملکوں کو دوسری وجہوں سے بھی کچھ رقمیں ادا کرنی ہوتی ہیں، مثلاً اگر ہماری تجارت کل کی کل انگریزی جہازوں کے ذریعہ ہو تو ہمیں ان انگریز جہاز راں کمپنیوں کو پونڈ کی شکل میں ادائگی کرنی ہوگی، یہ اور اس طرح کی دوسری ضرورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کی بدولت ہمیں دوسرے ملک کے سکوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تیسری بڑی دو سرمائے کی لین دین ہے۔ یہ لین دین دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ تھوڑی ہی مدت کے لیے لین دین، یا لمبے عرصے کے لیے لین دین۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ملک سرمائے کی کمی یا کسی اور وجہ سے کسی بیرونی ملک سے قرض لے۔ مثلاً آج کل حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی طرف سے بارہا اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کیلیے جتنے سرمائے کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود نہیں، اس لیے ہمیں باہر سے سرمایہ قرض لینا چاہیے، اس کے علاوہ ایک مقصد محض یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف سکوں کی خرید و فروخت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ اگر کسی وجہ سے یہ خیال ہو جائے کہ کسی ملک کے سکے کی قیمت میں اضافہ ہونیوالا ہے

تو اس سکے کو محض اس لیے کچھ لوگ خریدنا چاہیں گے کہ آئندہ قیمت میں اضافے کے بعد سے کسی اور سکے سے بدل کر نفع کمائیں گے۔

ان تینوں میں سے پہلی مد کو ہم تجارتی بیلنس کا نام دے سکتے ہیں، ان دیکھی تجارت کو بھی برآمد یا درآمد، جو ہماری دوسری مد ہے کبھی کبھی اس ضمن میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان کے متعلق ایک بات خاص طور سے ذہن میں رکھنے کی ہے، اگر کوئی بیرونی سکہ سرمایے کے طور پر قرض لیا گیا ہو اور اس لیے اس کی رسد میں اضافہ ہوا ہو تو یہ اضافہ عارضی ہو گا اور کچھ عرصے کے بعد جب اسکی ادائگی کا وقت آئے گا تو اس کی تلافی ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر ہم آج امریکہ سے کوئی رقم قرض لینا چاہیں تو ظاہر ہے ڈالر ہمارے لیے بیکار ہیں، ان کو ہم خود امریکہ میں چیزیں خریدنے کے کام میں تو لا سکتے ہیں، لیکن اگر ہم اس کا کوئی حصہ اپنے ملک میں استعمال کرنا چاہیں تو ہمیں اس کو روپے کی شکل میں بدلنا ہو گا۔ امریکہ نے قرض دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی حکومت ڈالر کی ایک متعین مقدار روپے کی شکل میں بدلنے کے لیے مہیا کر رہی ہے۔ چونکہ یہ ضروری نہیں کہ اسی وقت بیرونی زر کے بازار میں روپے کی بھی رسد بڑھ جائے اس لیے ہو گا یہ کہ جب تک قرض کی یہ رقم ہندوستان منتقل نہ ہو جائے امریکی ڈالر کی رسد زیادہ ہو جائے گی۔ لیکن جب ہم اس قرض کو ادا کرنے لگیں گے تو ہمیں ڈالر کی زیادہ ضرورت ہو گی، اس وقت مانگ زیادہ ہو گی، اور رسد کم دوسرے لفظوں میں اس قسم کی لین دین کا کسی ملک کے زر کی بیرونی قیمت پر عارضی اثر پڑ سکتا ہے، دائمی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زر کی بیرونی قیمت پر سرمائے کی لین دین کا اثر دوطرفہ ہوتا ہے، ایک وقت تو اس سے کسی زر کی رسد میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن پھر رسد کے اس اضافے کی تلافی مانگ کے اضافے سے ہو جاتی ہے اسی طرح بیرونی سکوں کی خرید و فروخت جو لوگ سٹہ بازی کی نیت سے کرتے ہیں اُن کی لین دین کا بھی یہی اثر ہوتا ہے۔ آج اگر کوئی بیوپاری کسی ملک کا سکہ اس امید میں خریدتا ہے ــــ یعنی مانگ میں اضافہ ــــ کہ آئندہ اسے بیچ کر نفع کا موقع ہوگا تو کچھ وقت گزرنے کے بعد جب وہ یہ سکہ بیچے گا تو اس سکے کی رسد میں لازمی طور پر اضافہ ہوگا۔ بیرونی سکوں کی مانگ اور رسد پر ان وجوہ سے جو اثرات پڑتے ہیں وہ ایک دوسرے کا اثر خود زائل کر دیتے ہیں۔

تجارت یعنی چیزوں کی لین دین ــــ اور اس ضمن میں ہمیں وہ لین دین بھی شامل کر لینی چاہیئے جو ان دیکھی تجارت کہلاتی ہے، یعنی مختلف خدمتوں کے لئے ادائیگی وغیرہ ــــ کی صورت اسی سے مختلف ہوتی ہے۔ جب کوئی ہندوستانی تاجر امریکہ سے کوئی چیز درآمد کرتا ہے اور اسکی قیمت چکانے کے لئے ڈالر خریدنا چاہتا ہے، تو کاروبار مکمل ہو جاتا ہے۔ اب آئندہ ایسا ہونا لازمی نہیں کہ یہی تاجر امریکہ کو اتنی ہی رقم کی چیزیں برآمد کرے اور اس لیے ڈالر کی مانگ میں جو اضافہ ہوا تھا اب اس کی تلافی ہو جائے۔ اس فرق کی خاصی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی سکے کی بیرونی قیمت میں وقتی تبدیلیاں تو بہت سے اسباب سے ہو سکتی ہیں، لیکن بنیادی اثر تجارت کا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کی کوشش ضروری ہے کہ تجارت کی مقدار کا

تعین کن چیزوں سے ہوتا ہے۔

ظاہر ہے اس سلسلے میں بنیادی سوال قیمتوں کا ہے۔ بیرونی تجارت کا دار و مدار لاگت کے فرق پر ہوتا ہے۔ اگر مختلف چیزوں کی لاگت اور قیمتیں سبھی ملکوں میں ایک سی ہوتیں تو بیرونی تجارت کا کوئی سوال ہی نہ اٹھتا۔ لیکن مختلف ممالک میں مختلف ذرائع کا تناسب الگ الگ ہوتا ہے اور اس لیے مختلف چیزوں کی لاگت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہو کہ کسی ملک میں عناصر پیداوار کو کس شرح سے معاوضہ دیا جاتا ہے تو ہم چیزوں کی تیاری میں جو لاگت آتی ہے اس کا پتہ لگا سکتے ہیں، پھر اس لاگت کا دوسرے کسی ملک میں چیزوں کی تیاری میں جو لاگت آتی ہے اس سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پھر اگر زر کی بیرونی قوت معلوم ہو تو ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی ملک کون سی چیز درآمد کرے گا اور کون سی چیزیں برآمد کرے گا، چیزوں کی درآمد اور برآمد میں ظاہر ہے کچھ خرچ اس میں ہوگا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں لانی لے جانی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں یہ رکاوٹ بھی آڑے آ سکتی ہے کہ حکومتیں درآمد برآمد پر پابندیاں لگا دیتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو ہم فی الحال نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کا دار و مدار کہ کوئی ملک کسی بیرونی ملک سے کوئی چیز منگائے گا یا نہیں اس پر ہوگا کہ جب مروجہ شرح مبادلہ (سکے کی بیرونی قیمت) پر اس چیز کی قیمت ملک کے اپنے سکے میں خود اندرون ملک کی پیدا کردہ چیز سے اس سے کم ہے یا زیادہ جتنا اس کے درآمد کرنے میں خرچ ہو جائے گا۔ اگر یہ چیز اتنی زیادہ سستی ہوتی کہ درآمد کا خرچ پورا کرنے کے بعد بھی ملک میں پیدا شدہ

چیز سے اب بھی سستی ہو، تو یہ چیز درآمد ہوگی، اگر اتنی مہنگی ہو کہ اسی چیز کے برآمد کرنے میں جو لاگت ہوتی ہے اُسے نکال کر بھی وہ بیرونی ملک میں سستی پڑے گی تو پھر یہ چیز برآمد ہوگی۔ اس طرح ہر چیز کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دو قیمتیں ہوتی ہیں۔ ایک درآمد کے لئے اُسے موزوں بنا دیتی ہے، دوسری برآمد کے لئے، اس کا انحصار اس کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں لانے لیجانے کی لاگت پر ہوتا ہے۔ ان دونوں حدوں کے درمیان قیمتوں میں تبدیلیاں ہوجائیں تو اس سے بین الاقوامی تجارت کی مقدار یا سکے کی بیرونی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ اگر کسی چیز کی قیمت اس سے زیادہ ہوجائے جس پر اسے درآمد کرنا مفید ہوتا ہے تو لازمی طور پر بیرونی چیزوں کا مقابلہ شروع ہوجائے گا، درآمد شروع ہوجائے گی اور بیرونی زر کی مانگ میں اضافہ ہوجائے گا۔ اگر قیمت اس سے کم ہوجائے جس پر اسے برآمد کرنے میں نفع ہوگا تو برآمد بڑھے گی اور بیرونی زر کی رسد میں اضافہ ہوگا۔

اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کوئی انتظام ممکن نہ ہو، یا اس میں لاگت بہت زیادہ ہو تو بین قومی تجارت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ اس کا دارومدار کہ کسی چیز میں بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت ہوگی یا نہیں اس پر ہوتا ہے کہ اسے لانے لیجانے کی لاگت، دونوں ملکوں میں اس چیز کے تیار کرنے کی لاگت کے فرق سے زیادہ ہے یا کم۔ اگر یہ لاگت کم ہو تو اس میں فائدہ ہوتا ہے کہ جہاں کوئی چیز سستی مل رہی ہو اُسے وہاں سے منگا لیا جائے اور جہاں مہنگی بکتی ہو وہاں بیچا جائے۔

یہاں تک کہ دونوں ملکوں میں (لانے لیجانے کی لاگت شامل کرکے) قیمت ایک ہی ہو جائے۔ اس سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے دو ملکوں میں کسی ایک چیز کے دام میں بھی فرق ہو جائے تو اس سے تجارت پر اثر پڑیگا۔ اگر کسی ملک میں قیمتوں کی عام سطح میں کمی بیشی ہو تو اس کا بھی لازمی طور پر تجارت کی مقدار پر اثر پڑے گا۔ مثلاً اگر ہندوستان میں قیمتیں افراط زر کی وجہ سے دگنی ہو جائیں اور انگلستان میں قیمتیں اپنی سطح پر قائم رہیں تو ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ انگلستان سے درآمد کرنا ہمارے لئے زیادہ سستا ہوگا، برآمد کرنا مشکل، اگر ہمارے ہاں چیزوں کی قیمت میں کمی ہو اور انگلستان میں قیمتیں پرانی سطح پر ہی قائم رہیں تو اس کے اُلٹے نتائج ہوں گے۔

بین الاقوامی تجارت کی مقدار پر کاروبار کی عام حالت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ خوشحالی کے زمانے میں اس کا امکان زیادہ ہوگا کہ خام اشیاء اور مکمل چیزوں کے درآمد کرنے کی مانگ بڑھ جائے۔ اس کے برخلاف اگر کساد بازاری ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کساد بازاری کا شکار ملک چیزوں کی درآمد کی مقدار میں کمی کرنے پر مجبور ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ملک جو اسے چیزیں مہیا کرتے تھے اب اپنی پیداوار کا ایک حصہ نہ بیچ سکیں اور اس طرح خود ان کے ہاں بھی کساد بازاری کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ پچھلی عالمگیر کساد بازاری کے پھیلنے کی صورت یہی تھی، امریکہ نے درآمد کی مقدار میں کمی کی، اور اسکی بدولت یہ سلسلہ پھیلتا گیا۔

بیرونی زر کی مانگ اور رسد کی اس توضیح کے بعد ہم پھر سکوں کی بیرونی قیمتوں کے تعین کے سوال کی طرف لوٹ سکتے ہیں ۔ چاہے مانگ اور رسد کی مقدار کا تعین کسی بھی سبب کی بنا پر ہو ، قیمتوں کے تعین کے اصول پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا وہ اب بھی اسی پر منحصر ہوگا کہ کسی قیمت پر کسی سکے (یا سب سکوں) کی مانگ اور اس کی رسد برابر ہو جائے گی ۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیرونی زر کی مانگ یا رسد میں تبدیلی سے لازمی طور پر بیرونی زر کے بازار میں اس کی قیمت پر اثر پڑے گا ، اب ہمیں ایک دوسرے سوال سے بحث کرنی ہے کہ ان تبدیلیوں کی صورت میں دوبارہ توازن کیونکر پیدا ہوگا ، اور بیرونی سکوں کی وہ شرح کونسی ہے جس پر بین الاقوامی لین دین میں توازن پیدا ہوگا ، ایسا توازن جو مستحکم ہو اور دیرپا ۔ اگلے باب میں ہم پہلے تو تبدیلیوں کی صورت میں توازن کیونکر پیدا ہوتا ہے اس سوال سے بحث کریں گے ، اور پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف سکوں کی بیرونی قیمت کا نقطۂ توازن کیا ہو سکتا ہے؟

نواں باب

ا۔ گولڈ اسٹینڈرڈ

پچھلے باب میں ہم نے سکّوں کی بیرونی قیمت کے تعین کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سکّوں کی بیرونی قیمت میں تبدیلیاں بالکل بے ضرر سی چیز ہیں، بلکہ ان تبدیلیوں سے بین الاقوامی لین دین میں توازن پیدا ہوتا ہے اس لئے ان کا رد و بدل ایک طرح اچھی چیز ہے۔ ایک حد تک یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ اگر یہ تبدیلیاں معمولی ہوں تو واقعی ان سے کوئی حرج نہیں ہوتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ان قیمتوں میں تبدیلیوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان سے بہت نقصان ہوگا۔ اور اس طرح کے رد و بدل سے لازمی طور پر بین الاقوامی تجارت پر بُرا اثر پڑے گا، مثلاً اگر کسی سکّے کی بیرونی قیمت اس دوران میں بدل جائے جب کسی نے ابھی ایک چیز بیچی ہے، اور اس کے دام نہیں چکائے گئے ہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس سودے میں جو نفع تھا وہ یکسر ختم ہو جائے، یا پھر اور بھی زیادہ ہو جائے۔ تجارت کے علاوہ بین الاقوامی مالی لین دین پر بھی اس سے بہت بُرا اثر پڑے گا، یہ بدلتی ہوئی قیمتیں ایک طرح کی عدم اعتماد کی کیفیت پیدا کر دیں گی، اور اس سے تجارت میں لازمی طور پر دقتیں

پیدا ہو جائیں گی، اب دنیا میں کوئی ملک بھی اپنے زر کی بیرونی قیمت میں رد و بدل کو یکسر آزاد چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور اس حق کی مدافعت اس دلیل سے کی جاتی ہے کہ "زر کی بیرونی قیمتوں میں تبدیلیاں مزید عدم یقین اور اندیشے پیدا کر دیں گی، اور اس سے تجارت پر ناخوشگوار اثر پڑیگا۔"

لیکن کچھ ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ یہ کچھ متضاد سی بات لگتی ہے کہ عام طور پر چیزوں کی لین دین میں تو طلب اور رسد کی کارکردگی کے اصول کو فیصلہ کن مان لیا جائے، لیکن اسے زر کی بیرونی قیمتوں کے تعین میں ناکارہ قرار دے کر اسے رد کر دیا جائے۔ اس لئے اس موضوع پر کچھ اور وقت خرچ کرنا چاہیئے۔ سکوں کی بیرونی قیمت میں بلا روک ٹوک تبدیلیوں سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ان میں سے چند کی طرف تو اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ایک بڑی بنیادی کمی یہ ہے کہ اس سے اندرون ملک کے معاشی استحکام پر ناخوشگوار اثر پڑے گا کیونکہ جیسے ہی اس کے زر کی بیرونی قیمت میں کمی بیشی ہوئی درآمد اور برآمد تجارت متاثر ہو جائے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ملک کو اس کے لئے تیار رہنا پڑے گا کہ جیسے ہی زر کی بیرونی قیمت میں کوئی رد و بدل ہو "مختلف عناصر پیداوار کو ضرورت کے لحاظ سے برآمد کی چیزیں پیدا کرنے، یا ملک کی اندرونی ضرورتوں کو پورا کرنے والی صنعتوں میں لگا دیا کرے۔" یہ کام نظری طور پر دشوار نہیں لیکن عملاً اس میں بڑی کمزوریاں ہیں اور اس سے ذرائع پیداوار کے ضائع

جانے کے علاوہ اور کچھ حاصل ہونے کی امید بہت کم ہے
اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ بھی نہیں نکالنا چاہیئے کہ زر کی بیرونی قیمت میں استحکام ہمیشہ ہی پسندیدہ چیز ہے، لیکن اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں گولڈ اسٹینڈرڈ کے متعلق کچھ جان لینا چاہیئے کیونکہ اس پر بحث سے ہمیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ زر کی بیرونی قیمت کا استحکام بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ اس معیار کا سب سے اہم مقصد ـــــ یا فائدہ ـــــ یہی تھا کہ زر کی بیرونی قیمتوں میں استحکام رہے۔ گو یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اسکی ایجاد اس لیئے ہوئی کہ زر کی بیرونی قیمت میں استحکام کے فوائد اس کے متقاضی تھے کہ یہ اسٹینڈرڈ وجود میں آئے۔ یہ فائدہ تو اتفاقی تھا، اور کرنسی کے نظام کے ارتقاء کا نتیجہ۔ ابتداء میں سکے دھات کے ہوتے تھے، اور دھاتوں میں سونا سب سے بہتر اور مقبول ہوا اس لئے دھیرے دھیرے سکے سونے کے بننے لگے۔ اور اس معیار نے کئی شکلیں اختیار کیں، سب سے پہلی شکل تو وہ تھی جب سونے کے سکے یا کاغذ کے نوٹ جن کے بدلے میں سونے کے سکے ملیں استعمال ہوتے تھے، پھر سونے کے سکوں کے استعمال کی فضول خرچی کے احساس نے دوسری شکل دی۔ ہونے یہ لگا کہ سکوں کے بجائے حکومت سونے کی کوئی بھی مقدار ایک متعین قیمت پر خریدنے اور بیچنے کیلئے تیار رہنے لگی، اور اس لئے سکے بجائے سونے کے سکوں سے بدلے جانے کے اب دھات سے بدلے جانے لگے۔ ایک تیسری شکل یہ تھی کہ مرکزی بینک یہ وعدہ کرتا ہے کہ ملک کے سکوں کو بجائے سونے کے سکوں، یا دھات کی شکل میں بدلنے کے وہ انھیں کسی ایسے ملک کے

سکے سے بدل دیگا جہاں پہلی دو شکلوں میں سے کسی میں بھی معیار طلا کام کر رہا ہو۔ شروع شروع میں جیسا کہ اس کتاب کے پہلے صفحات میں کہا گیا ہے۔ عام خیال تھا کہ زر کی قیمت دھات کی قیمت پر مبنی ہوتی ہے جس سے وہ سکہ بنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گولڈ اسٹینڈرڈ اتنا مقبول تھا۔ آج بھی کبھی کبھی یہ آواز سنائی دی جاتی ہے کہ اگر دنیا کے سبھی ملک اسے اختیار کر لیں تو بین الاقوامی لین دین کی بہت سی خرابیاں دور ہو جائیں۔ مختلف ملک اب بھی زر کی مقدار کو قانوناً پابند رکھنے کی کوشش میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ محفوظ سرمایہ کے طور پر سونا ضرور ہو۔

ان تینوں شکلوں میں سے کوئی بھی معیار اختیار کرنے کے بعد لازمی طور پر ہوتا یہ ہے کہ سکے کی بیرونی قیمت ایک سطح پر مستحکم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کا اسٹینڈرڈ اختیار کرنے کے بعد حکومت مرکزی بنک پر یہ پابندی لگا دیتی ہے کہ وہ ہر لمحہ متعین قیمتوں پر سونا خریدنے اور مہیا کرنے پر آمادہ رہے۔ ایک ایسے ادارے کی موجودگی سے جو غیر محدود مقدار میں سونا خریدنے اور بیچنے پر تیار ہو، سونے کی قیمت اور سکے کی بیرونی قیمت میں زیادہ فرق نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجیے کسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایسے ملک کے جو "سونے کا معیار" اختیار کر چکا، سکے کی بیرونی قیمت گھٹ جاتی ہے، تو بجائے اس کے کہ اس ملک کے تاجر سکے بدلیں، ضرورت بھر سونا خرید کر دوسرے ملک کو بھیج سکتے ہیں۔ اس صورت میں تو ظاہر ہے دو سکوں کی باہمی قیمت عام حالات میں سونے کی مقدار پر ہوگی جو ان سکوں میں

لگی ہوئی ہے، یا جو قانوناً متعین ہوئی ہو۔ مثلاً اگر ایک پونڈ اور چار ڈالر دونوں میں برابر سونا ہو، تو دونوں کی قیمت ۱=۴ سے کم یا زیادہ نہ ہوگی۔ سونا ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لیجانے میں کچھ لاگت آتی ہے، مثلاً ۱۹۲۵ء میں ایک اندازہ لگایا گیا تھا کہ بحر اٹلانٹک کے پار ایک پونڈ کی قیمت کا سونا لیجانے میں کوئی ۱ ۳/۴ سنٹ (امریکن سکہ) لاگت آتی ہے۔ اگر بازار میں ڈالر اور پونڈ کی شرح مبادلہ میں اتنی کمی ہو جائے کہ سونا برآمد کرنے یا درآمد کرنے کا خرچ بھی پورا ہو سکے، تو سونا ادھر سے ادھر منتقل کیا جانے لگے گا۔ اس طرح سونے کے درآمد ہونے کی ایک حد تھی، ایک برآمد کی، اور دو سکوں کی باہمی قیمت، جبکہ دونوں سونے کے سکے ہوں، یا سونے پر ان کی بنیاد ہو، ان حدوں سے اوپر یا نیچے نہیں جا سکتی تھی۔ اور چونکہ یہ فرق بہت ہی خفیف سا تھا اس لئے زر کی بیرونی قیمت میں عملاً بہت ہی غیر معمولی استحکام ہوتا تھا۔

شروع شروع میں جب سونے کے سکوں کا رواج تھا زر کی بیرونی قیمت کے استحکام میں کوئی دقت نہیں تھی، اس کا تعین سونے کی مقدار سے ہوتا تھا جو دو سکوں میں لگی ہو۔ لیکن جب کاغذ کے نوٹوں کا رواج ہو گیا تو اس صورت حال میں تھوڑی سی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ نوٹوں کے رواج کے بعد یہ انتظام ضروری ہو گیا کہ انھیں سونے کی شکل میں جب بھی ضرورت ہو اور جتنی بھی مقدار میں ضرورت ہو بدل دیا جائے۔ یہ یقین نہ ہو تو اس اسٹینڈرڈ کا قائم رہنا نا ممکن ہو جاتا۔ کیونکہ اس کی کارکردگی

کی صورت یہ تھی کہ اگر بیرونی زر کے بازار میں کسی سکے کی مانگ کم یا زیادہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے قیمت میں کمی یا زیادتی ہو جائے تو اس رسد کی زیادتی اور فاضل مانگ کو بیرونی زر کے بازار پر اثر نہ ڈالنے دیا جائے، مانگ میں کمی ہو تو اسے مرکزی بینک پورا کر دے، اور اضافہ ہو جائے تو اپنے پاس سے اسے پورا کر دے۔ یہ انتظام نہ ہو تو پھر بازار میں ہی سب سودے چکتے ہوں گے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیرونی قیمت کا استحکام ناپائدار سی چیز بن جائے گا۔ لیکن اس انتظام کے لئے یہ ضروری شرط تھی کہ حکومت یا مرکزی بینک اس کا کوئی پکا انتظام کر دے کہ جب بھی ضرورت ہو سونے کے عوض ملک کے اندر کا رائج الوقت سکہ اور سکے کے بدلے میں سونا مہیا کر دے۔

ظاہر ہے اس کی صورت ایک ہی ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ جب مرکزی بینک کے ہاتھ میں سونا آنے لگے، یا دوسری صورت میں ہاتھ سے نکلنے لگے تو وہ کوئی ایسی صورت اختیار کرے جس سے یہ رجحان ختم ہو جائے، اگر کسی ملک میں سونا غیر محدود مقدار میں آ رہا ہے، یا اس کے ہاتھ سے غیر محدود مقدار میں باہر جا رہا ہے تو اس معیار کا باقی رکھنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ کسی کے پاس سونے کی غیر محدود مقدار نہیں ہوتی۔ سونے کے اسٹاک میں کمی سے آئندہ سکوں کے عوض سونا دینے میں مشکل پیدا ہو جائے گی اور اس لئے کوئی بھی ملک غیر متعین مدت کے لئے سونا باہر جانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف جس ملک میں یہ سونا داخل ہو رہا ہو اس کے لئے بھی کچھ دقتیں پیدا

ہو جائیں گی۔ اگر کسی ملک کے مرکزی بینک کو لامحدود مقدار میں سونا خریدنا پڑے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا تو اس کا سرمایہ اس کے خریدنے میں پھنس جائے گا اور سونا جمع کر کے وہ کچھ کما نہیں سکے گا، بینک کے اخراجات نکال لینے کے لالے پڑ جائیں گے، لیکن ان دونوں میں پہلی صورت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور گولڈ اسٹینڈرڈ کی تاریخ میں سونا لینے سے انکار کرنے کی تو ایک ہی مثال ملتی ہے، لیکن سونا ہاتھ سے نکلنے سے گھبرا کر ایسا کئی بار ہوا کہ بہت سے ملکوں نے مزید سونا ادا کرنے سے انکار کر دیا اس لیے اس اسٹینڈرڈ کے باقی رکھنے کی ضروری شرط یہ تھی کہ بیرونی زر کے بازار میں کسی سکے کی مانگ اور اس کی رسد زیادہ دنوں تک غیر متوازن نہ رہنے پائیں۔ اور یہ اسی صورت میں کیا جا سکتا تھا جب دونوں ملکوں کی درآمد برآمد تجارت کو کسی طرح متاثر کیا جا سکے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں سکوں کی بیرون ملک میں مانگ کی بنیادی وجہ تجارت کی ضرورتیں ہیں۔ ایسے ملک کے سکے کی لین دین میں سٹہ بازی کا بہت کم دخل ہوگا جس کی بیرونی قیمت سونے سے رشتے کی بدولت متعین ہو۔ ہاں سرمائے کی نقل و حرکت کا اثر ہو سکتا ہے۔

تجارت کی مقدار پر جو بنیادی اثر کام کرتا ہے وہ قیمتوں کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک میں مختلف چیزوں کی لاگت اور اس لیے قیمتیں کسی اور ملک کے مقابلے میں زیادہ ہوں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دوسرے ملک سے پہلے ملک کے لوگ کم چیزیں خریدیں گے، ان دونوں کو ہم "سستا" اور "مہنگا"

ملک کہہ سکتے ہیں۔ "مہنگے" ملک کے لینے والے "سستے" ملک سے چیزیں منگائیں گے، اس لئے انہیں "سستے" ملک کے زر کی ضرورت ہوگی، لیکن چونکہ "سستے" ملک کے لینے والے ان سے کچھ نہیں خریدیں گے یا اگر کچھ خریدیں گے تو بہت کم اس لئے ان کے بہت کم تاجر اپنے سکے کے بدلے میں "مہنگے" ملک کے سکوں کے طلبگار ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں "سستے" ملک کے سکوں کی مانگ زیادہ ہوگی، اور رسد کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "مہنگے" ملک کے رہنے والوں کو ان کے سکے حاصل کرنے کیلئے اپنا زیادہ زر دینا ہوگا۔ چونکہ۔ ہم فرض کر رہے ہیں۔ دونوں کا نظام زر سونے پر مبنی ہے اس لئے "مہنگے" ملک کے تاجر بجائے زر کے سونا خرید کر بھیجنا شروع کر دیں گے۔ چونکہ یہ "مہنگے" ملک کی قیمتیں عام طور پر زیادہ ہیں اس لئے سونے کی برآمد کا سلسلہ طویل ہوگا۔ اس کے برخلاف "سستے" ملک میں مستقل سونا آئے گا۔ اس درآمد برآمد کو روکنے کی ایک ہی ترکیب ہو سکتی تھی، اور وہ یہ کہ ایسے قدم اٹھائے جائیں جن سے دونوں ملکوں کی قیمتوں میں کوئی ایسا رشتہ پیدا ہو جائے کہ ان کی درآمد اور برآمد تجارت، اس لئے ان دونوں کے سکوں کی مانگ اور ان کی رسد متوازن ہو جائیں۔ دوسرے الفاظ میں ان حالات میں یہ ضروری ہوگا کہ "سستے" ملک کی قیمتوں میں کچھ اضافہ ہو اور "مہنگے" ملک کی قیمتوں میں کمی۔

اس مقصد کے لئے اس اسٹینڈرڈ کی کارکردگی کے لئے ایک بہت

سیدھا سادہ سا اصول وضع کیا گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسکی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ زر کا نظریہ مقدار صحیح ہے، اور زر کی قیمت اس کی مقدار پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ اصول یہ تھا کہ جب کوئی ملک یہ دیکھے کہ سونا اس کے ہاتھ سے نکل کر باہر جا رہا ہے تو اسے فوراً اپنے ملک میں زر اعتبار کی مقدار میں کمی کرنی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی بنیک کو اپنی شرح سود میں اضافہ کرنا چاہئے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے جو رقمیں باہر جا رہی ہوتیں وہ رک جاتیں، کیونکہ اب انہیں زیادہ سود مل جاتا، دوسرا فائدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بیرون ملک سے لوگ تھوڑی مدت کے لئے رقمیں اس ملک کو منتقل کرنے لگیں جہاں شرح سود میں اضافہ ہوا ہے، اس ملک کے بنیک جو کچھ رقمیں باہر کے لوگوں کو قرض کے طور پر دینے کو تیار ہوتے اس میں کمی آجاتی کیونکہ اب یہ قرض مہنگا ہوتا اور باہر کے لوگ اس سے بچتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بیرونی زر کے بازار میں اس ملک کے سکے کی رسد کم ہو جاتی، اور سب سے آخر میں اور سب سے دھیرے دھیرے بلاشبہ یہ اثر بھی ہوتا کہ قیمتوں میں بھی کمی ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر کسی ملک میں سونا آرہا ہو اور یہ سلسلہ نہ رکتا نظر آئے تو اس کیلئے راستہ یہ تھا کہ وہ اعتبار کی مقدار میں اضافہ کرے، اور قرض کی لین دین میں سہولت پیدا کرے جس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوتا کہ اس ملک کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا۔ اس طرح معیار طلا کی کارکردگی کا سنہرا نسخہ یہ تھا "جب سونا ملک کے اندر آئے تو زر اعتبار کی مقدار میں اضافہ کرو، جب سونا باہر جانے لگے تو

زر اعتبار میں کمی کرو، جب سونے کے سکّوں کا رواج تھا، اور سکّے ڈھلوانے کا حق لامحدود تو یہ نسخہ ایسا تھا جس پر عمل تقریباً از خود ہو جاتا تھا۔ آپ کے پاس کسی چیز کی قیمت کے طور پر سونا آتا تو آپ اسے زر کی شکل میں بدل لیتے، اور اس زر کے ذریعہ اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے، سونا آنے کا لازمی مطلب زر کی مقدار میں اضافہ، سونا کھونے کا مطلب زر کی مقدار میں کمی ہوتا۔ ۱۹۱۴ء تک بھی یہ تعلق اتنا قریبی تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ گولڈ اسٹینڈرڈ کی کارکردگی میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی کارکردگی کے لئے ماحول سازگار بنا لیتا ہے۔ بینک آف انگلینڈ —— اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ زمانہ برطانیہ کی مالی عظمت کا زمانہ تھا، دنیا کی تجارت کا مرکز انگلستان تھا، دنیا کی مالی لین دین کا مرکز لندن کے پاس فاضل سونے کی مقدار بہت تھوڑی ہی ہوتی تھی، اور اس کئے اس میں تھوڑی سی بھی کمی ہوتی تو بنیک کوئی اقدام کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں اس محفوظ سونے پر دو طرح کے مطالبات ہوتے تھے۔ اگر انگلستان میں قیمتوں میں اضافہ ہوتا تو ایک طرف تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سونا برآمد ہونے لگتا، دوسری طرف مہنگائی کی بدولت اندرون ملک بھی زر کی مانگ میں اضافہ ہوتا، اور زر کی مانگ میں اضافے کا مطلب یہ تھا کہ سونے کی مانگ ملک کے اندر سکوں کی شکل میں بڑھ جاتی اسی طرح جب انگلستان میں قیمتیں گرتیں تو سونا اندر آنے لگتا، اور یہ صورت بھی نقصان کی تھی۔ اس لئے بینک اپنے مفاد کی حفاظت کی خاطر

ان دونوں صورتوں میں اعتبار کی مقدار میں کمی وبیشی کرنے پر مجبور ہوتا تھا اور اس معنی میں یہ کہنا ایک حد تک بجا تھا کہ گولڈ اسٹینڈرڈ کی کارکردگی میں ایک اندرونی اثر ایسا تھا جو ازخود اصلاح حال کے امکانات پیدا کردیتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی برتری کا راز یہ ہے کہ اس کی کارکردگی میں حکومت یا کسی اور کا کوئی بڑا دخل نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسٹینڈرڈ ازخود ایسے اسباب پیدا کردیتا ہے جن کی تلافی ناگزیر ہوتی ہے، اور حکومت یا مرکزی بنک کا کام محض اتنا ہوتا ہے کہ وہ ان اشاروں پر چلے، یہ فیصلہ مرکزی بنک کے ہاتھ میں نہیں ہوتا کہ کیا کرنا چاہئے، یہ تو خود اس معیار کی کارکردگی کے نتائج یا رجحانات بتا دیتے ہیں۔ معاشیات کے ماہرین میں ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا ہے جنھیں انسان کی عقل اور سمجھ پر ذرا بھی بھروسہ نہیں۔ وہ ایک چیز ہی کی طاقت ایک ان دیکھے ہاتھ پر اعتماد رکھتے ہیں جس کے متعلق انھوں نے خود کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ وہ بہتری کا ضامن ہے، اس رائے کے حامیوں کی نظر میں گولڈ اسٹینڈرڈ کی برتری اسی میں ہے کہ وہ ہمیں مرکزی بینک کے اقتدار سے بے نیاز کردیتا ہے، اور حکومت یا مرکزی بینک کی طرف سے، اُن کے فیصلے کی غلطی کی بدولت نقصان کا امکان باقی رکھنا۔ مرکزی بینک کے منتظمین کو عقل وخرد سے بیگانہ مان لیجئے، یا پھر اتنا کمزور کہ زر کی مقدار میں اضافے کے اختیارات کو استعمال کرنے میں وہ کسی ضرورت مند حکومت کے اشارے کے خلاف نہیں جاسکیں گے، تو ضرور یہ بات خوشی کی ہے کہ مرکزی بنک کے

اقتدار یا اختیارات کو ان سنہری زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہے۔" لیکن یہ رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اور گولڈ اسٹینڈرڈ کی کارکردگی میں بھی حکومت یا مرکزی بینک کے فیصلوں کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس معیار کو اختیار کر لینے کے بعد مرکزی بینک کو ہر طرف سے منہ موڑ کر بس زر کی بیرونی قیمت کی پائداری کی کوشش کرتے رہنا ہوتا ہے۔ اسے اعتبار کی مقدار میں اضافہ محض اسی وقت کرنا چاہیے جب سونا ملک میں آرہا ہو، اور اعتبار مقدار میں کمی محض اس صورت میں جب سونا باہر جارہا ہو، اور یہ ضروری نہیں اس پالیسی کا نتیجہ ملک کے معاشی نظام کی کارکردگی کے لئے بھی موزون ہو۔ دوسرے الفاظ میں زر کی بیرونی قیمت کا استحکام، اور اندرونی معاشی نظام کی کارکردگی میں استحکام، ان دونوں مقاصد میں تضاد ہوسکتا ہے، جو پالیسی ایک کے لئے موزوں ہو، دوسرے کے لئے زہر ہوسکتی ہے، اس لئے باوجود اس کے کہ اس معیار کے اختیار کر لینے سے زر کی بیرونی قیمت میں استحکام آجاتا ہے اس کی کارکردگی سے بہت سی اور شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں، اور اب سبھی ملکوں نے اس اسٹینڈرڈ کو ترک کر دیا ہے۔ جیسے وہ سکے کی قیمت میں بلا روک ٹوک تبدیلیوں کے خلاف ہے ویسے ہی ان کی پائداری بھی جو گولڈ اسٹینڈرڈ نہیں دیدیتا ہے مشتبہ نظروں سے دیکھی جانے لگی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء تک معاشی فضا سازگار تھی اس لئے یہ اسٹینڈرڈ خاصی کامیابی سے کام کرتا رہا۔ اور مختلف اسباب کی بنا پر اسکی خرابیوں کو نمایاں ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بین الاقوامی معاشی لین دین میں

کسی قسم کی پیچیدگیاں بلکہ ابتری ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، مختلف ملکوں میں قیمتیں اور لاگت ایک دوسرے سے ہم آہنگ سی تھیں، اور سرمائے کی لین دین سے ان ملکوں کی دقتیں حل ہو جاتی تھیں جنھیں وقتی طور پر بیرونی زر کے سلسلے میں دقتیں پیش آ رہی ہوں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے اجرتوں کے متعلق ہم یہ فرض کر سکتے تھے کہ وہ پیداوار کی کارکردگی کے لحاظ سے خود بخود اس طرح بدل جائیں گی کہ مختلف ملکوں کی خاص خاص چیزوں کے تیار کرنے کی صلاحیت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ دنیا کا معاشی نظام اس وقت ترقی کر رہا تھا، نئی نئی صنعتیں وجود میں آ رہی تھیں، نئے نئے علاقوں کی تجارت پھیل رہی تھی، اور قیمتوں کا عام رجحان اضافے کی طرف تھا جس کا مطلب موٹے طور پر یہ تھا کہ خوشحالی کا دور دورہ تھا، اور اس لئے قیمتوں اور لاگت میں جس قسم کے توازن کی ضرورت پڑتی تھی وہ بہ آسانی ہو جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس معیار کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ اچھے دنوں کا ساتھی ہے جب معاشی نظام کی کشتی طوفانوں کے ہاتھ میں ہو تو اس معیار سے سہارے کی امید نہیں لگائی جا سکتی بلکہ ایسے حالات میں یہ معیار بہت خرابیوں کا باعث بن جاتا ہے۔ جب سونا بڑی مقدار میں باہر جانے لگے تو اس پر عمل بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے۔ فرض کیجیے کسی وجہ سے امریکہ میں قیمتوں میں کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے، اور انگریزی قیمتیں مستحکم رہتی ہیں، ان دونوں ملکوں کی تجارت پر ایک نہ ایک اثر ضرور پڑے گا۔ اگر امریکی قیمتیں زیادہ ہو گئی ہیں تو امریکہ کے ہاتھ سے

سونا نکل کر انگلستان پہونچے گا۔ اب انگلستان میں اضافہ زر ضروری ہے لیکن یہ اضافہ انگلستان کے اپنے مفاد کے لحاظ سے مناسب ہو نہ ہو اور ممکن ہے اضافے سے ملک کی معیشت پر ناخوشگوار اثر پڑے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی معیار کے اختیار کرنے کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا کہ انگلستان اپنی قیمتوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان دقتوں کی بدولت جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے گولڈ اسٹینڈرڈ کو وہ مقبولیت حاصل نہیں رہی جو کبھی تھی" اب اگر کبھی سونا اندر آنے لگے تو اس سے لازمی طور پر زر کی مقدار میں اضافہ کوئی بھی ملک نہیں ہونے دیگا اس کے برخلاف اگر کہیں قیمتوں میں کسی وجہ سے کمی ہو جائے تو کوئی ملک بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس کی اجرتیں اور قیمتیں بھی کم کی جائیں، ان حالات میں گولڈ اسٹینڈرڈ کا بتایا ہوا نسخہ کام نہیں کر پائے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسٹینڈرڈ خود ہی ٹوٹ جائے"۔ بدلے ہوئے حالات میں گولڈ اسٹینڈرڈ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ کم سے کم یہ تو بغیر کسی پس و پیش کے کہا جا سکتا ہے کہ اپنی پرانی شکل میں گولڈ اسٹینڈرڈ کے احیا کا امکان نہیں رہا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اختیار کرنے سے کساد بازاری کا رجحان زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مسٹر جون رابنسن نے کہا ہے اس کے اختیار کرنے سے تفریط زر کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے کسی ملک میں سونا آنے لگے تو یہ درآمد بند کرنے کے لئے کوئی ایسی مجبوری نہیں ہوتی کہ زر کی مقدار میں ضرور ہی اضافہ ہو جائے۔ اس کے برخلاف سونا باہر جاتا ہے

نکلنے لگے تو زر کی مقدار میں کمی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں
اس اسٹینڈرڈ کی مشینری ایسے کام نہیں کرتی کہ دونوں پر ایک ہی طرح کا
اثر پڑے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مرکزی بینک
اعتبار کی مقدار میں کمی کرنا چاہے تو اسے عام بینکوں پر مقابلتہً زیادہ قابو
حاصل ہوتا ہے، اعتبار میں اضافہ پر انہیں ابھارنا مقابلتہً مشکل ہوتا ہے۔
مرکزی بینک یہ انتظام نہیں کر سکتا کہ عام بینک جو زر اعتبار پیدا کریں اسکی
مانگ پیدا ہو جائے، ہاں اگر زر اعتبار کی مانگ ہو تو مرکزی بینک یہ
ضرور کر سکتا ہے اور عموماً کرتا ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دے کہ اعتبار
کی کمی نہ رہے۔ بعض ملکوں کی بیرونی تجارت اور لین دین اندرونی
تجارت سے زیادہ اہم ہوتی ہے، اور بعض ایسے ہیں جن کے لئے اندرونی
تجارت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ گولڈ اسٹینڈرڈ ان دونوں کیلئے
یکساں نتائج کا باعث نہیں ہوتا۔ جن کے لئے بیرونی تجارت زیادہ اہم
ہوتی ہے وہ تو اسٹینڈرڈ کی ضرورتوں کے مطابق پالیسی بہ آسانی
عمل کر سکتا ہے لیکن جس کے لئے اندرونی تجارت زیادہ اہم ہو، اس کیلئے
زیادہ اہم اسی کا استحکام ہوگا، اور زر کی بیرونی قیمت کے استحکام کی
خاطر جو پالیسی موزوں ہو اُس کا اختیار کرنا بہت دشوار ہوگا۔ پھر مختلف ملک
ایک ہی حیثیت اور ایک ہی جیسے نہیں ہوتے۔ ایک چھوٹے سے ملک کا
سونے کا ذخیرہ بھی مختصر سا ہوگا۔ اس کے لئے تو تھوڑا سا سونا ہاتھ سے
نکل جائے تو یہ بڑی پریشانی کی بات ہوگی۔ گولڈ اسٹینڈرڈ یا کسی

بین الاقوامی نظام کے اختیار کرنے کا آج کے حالات میں بیشتر ملکوں پر بہت ہی ناخوشگوار اثر ہوگا۔ چنانچہ کینس نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ " امریکہ میں اگر برآمد تجارت کی زیادتی کی وجہ سے سونا آنے لگے تو اس سے امریکہ میں توسیع زر کے امکانات اس سے کہیں کم ہوں گے جتنی دوسرے ملکوں کو ان حالات میں زر کی مقدار میں کمی کرنی پڑے گی "۔

اس سے پہلے ہم اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ زر کی بیرونی قیمت کو آزاد چھوڑ دینا کہ وہ جیسے چاہے بدلتا رہے ممکن نہیں، اب گولڈ اسٹینڈرڈ کی کارکردگی کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ زر کی بیرونی قیمت کا استحکام بھی بے ضرر نہیں۔ اس لئے اب ہمیں کسی ایسی پالیسی کی تلاش کرنا چاہئے جو ان دونوں کی خرابیوں سے پاک ہو، اور اس لئے سب کے لئے قابلِ قبول۔ اس مسئلے کا حل کرنے کے لئے ایک تصوّر کی مدد لی گئی ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ ہر ملک کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے زر کی بیرونی قیمت متوازن رہے۔ اس متوازن شرح مبادلہ کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ " وہ شرح جس سے بین الاقوامی لین دین عرصے تک متوازن رہے۔ اور ملک کے پاس جو بین الاقوامی زر کا ذخیرہ (مختلف ملکوں کے سکّے، سونا وغیرہ) جمع ہو اس میں کمی یا زیادتی نہ ہو۔ جب کبھی لین دین کے حالات میں کوئی بنیادی ردوبدل ہو تو ملک کے سکّے کی قیمت میں مناسب تبدیلی کر دی جائے۔ اس شرح کو باقی رکھنے

کے لئے مرکزی بینک کو بیرونی سکّوں کی خرید و فروخت کے لئے آمادہ رہنا ہوگا اور کوشش یہ کرنی ہوگی یہ شرح ایسی ہو کہ اگر کچھ عرصے تک اس کے تحت بیرونی زر ہاتھ سے نکلے تو کچھ عرصے بعد اتنا ہی بیرونی زر واپس بھی آئے، تاکہ بیرونی زر کے اوسط ذخیرے میں کمی بیشی نہ ہو۔ اس متوازن شرح مبادلہ کی کچھ خصوصیات گنوائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ اس کی بدولت بہت زیادہ بے روزگاری نہ پیدا ہونے پائے۔ اگر شرح مبادلہ بہت اونچی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ درآمد تجارت میں اضافہ ہوگا کیونکہ باہر کے ملکوں کی چیزیں سستی ہو جائیں گی، لیکن برآمد بالکل بند یا بہت کم ہو جائے گی۔ اور اس طرح اس ملک کی برآمد اور تجارت اور اس تجارت کے لئے چیزیں تیار کرنے والی صنعتیں بیکار ہو جائیں گی، اور ان میں بیروزگاری پھیل جائے گی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ہم نے کسی طرح یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ روپے اور اسٹرلنگ کے درمیان متوازن شرح مبادلہ یہ ہے = ایک روپیہ = ایک شلنگ چھ پنس۔ اب اگر ہم ایک روپے کی قیمت مثلاً دو شلنگ کر دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں سے ایک روپے کی کوئی چیز خریدنے میں انگریز خریدار کو دو شلنگ دینے ہوں گے، پہلے سے ایک شلنگ چھ پنس ہی دینے ہوتے، اب اسے چھ پنس اور دینے پڑتے ہیں گویا ہماری چیزیں انگلستان میں مہنگی ہو جائیں گی، اس کے برخلاف پہلے انگریز تاجر ہمیں وہی چیزیں بھیج سکتے تھے جن کی لاگت (مع نفع) ایک شلنگ چھ پنس کے لگ بھگ ہو۔

اس شرح مبادلہ کی بدولت اب وہ چیزیں بھی نہیں بھیج سکتے ہیں جن کی لاگت دو شلنگ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں جب ہندوستان میں آئیں گی تو ان صنعتوں کو مقابلے میں نیچا دکھا دیں گی جن کی لاگت ایک روپیہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری برآمد تجارت پر برا اثر پڑے گا۔ اور اس کی بدولت ہمارے ملک میں بے روزگاری پھیل سکتی ہے، یا کم سے کم پیدا ہو سکتی ہے۔ اور درآمد تجارت میں توسیع و ترقی، اس صورت حال کو غلط طور پر زر کی بیرونی قیمت کی زیادتی "سے تعبیر کر سکتے ہیں (OVER VALUATION)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی ملک اپنے سکے کی قیمت کم کر دے (DEVALUATION) اوپر کی مثال میں ہندوستانی سکے کی قیمت زیادہ ہے، لیکن شلنگ کی بیرونی قیمت کم ہے۔ اس کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی برآمد تجارت کو شرح مبادلہ کی بدولت مدد مل رہی ہے، اور برآمد تجارت اس وجہ سے فروغ پا سکتی ہے اور درآمد تجارت پر ایک طرح کی پابندی لگ گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شرح مبادلہ کو تجارت کی مقدار کے تعین میں بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ تجارت کی مقدار کا تعین اس بات پر ہی ہونا چاہیے کہ مختلف ملک اپنی جداگانہ صلاحیتوں کی بدولت مختلف چیزیں سستے داموں تیار کر سکتے ہیں، ہر ملک وہ چیز برآمد کرے جو وہ دوسروں سے واقعی سستی بناتا ہو، وہ چیزیں منگائے جو دوسرے واقعی سستی بناتے ہیں۔

زر کی ایسی متوازن بیرونی قیمتیں اگر متعین ہو جائیں تو ان کے متعلق

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دائمی طور پر متوازن رہیں گی۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ یہ کچھ بنیادی اسباب کی بنا پر متعین ہوں گی اس لئے یہ قدرے دیرپا ہوں گی، لیکن دائمی نہیں کیونکہ یہ بنیادی اسباب خود بدل سکتے ہیں۔ اب اگر بنیادی اسباب بدل جائیں تو اُن کے لحاظ سے سکوں کی بیرونی قیمتوں میں بھی تبدیلی ہو جانی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ قیمتیں کچھ عرصہ تک تو مستحکم رہیں گی جس کا مطلب یہ ہوا کہ بلا روک ٹوک ان قیمتوں میں تبدیلیوں کی خرابی سے نجات مل جائے گی، لیکن جب حالات کا تقاضا ہوگا یہ بدل بھی جائیں گی اس لئے زر کی بیرونی قیمت کے دائمی طور پر مستحکم ہو جانے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی مشکل یہ ہے کہ نظری طور پر تو زر کی ایسی بیرونی قیمتوں کا تصور ممکن ہے جنھیں ہم "متوازن" کہہ سکیں، لیکن اس تصور سے عملی زندگی میں فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری یہ ہوگا کہ ہم "توازن" کی کوئی ایسی تعریف کر سکیں جس سے عملی اقدامات کے لئے رستہ بالکل صاف ہو جائے۔ بدقسمتی سے یہ ممکن نہیں۔ نظری طور پر جو چیز بہت اچھی معلوم ہوتی ہے عملی زندگی میں اس سے کام لینا بڑا مشکل ہے۔

۲ - قوّت خرید کی مساوات کا نظریہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مختلف سکوں کی لین دین تجارت کی ضرورت کی بنا پر پڑتی ہے اور تجارت کی مقدار پر سب سے زیادہ بنیادی اثر قیمتوں کا ہوتا ہے۔ ان کی مدد سے کیا ہم "متوازن" شرح مبادلہ نہیں معلوم کر سکتے۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جب تک مختلف ملک گولڈ اسٹینڈرڈ اختیار کر کے اسے باقی رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں، غلط یا صحیح ایک پالیسی کا تعین ہوتا ہے، اور ایک مقصد معلوم۔ لیکن جب یہ اسٹینڈرڈ ترک کیا جا چکا ہو تو جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں مقصد کا تعین بہت مبہم طریقے سے ہی کیا جا سکتا ہے اب سبھی ملک اسی مبہم مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے بھی یہ کوشش بہت ضروری ہے کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ زر کی بیرونی قیمت کے متعلق کونسا رویہ صحیح ہوگا۔

قوت خرید کی مساوات کا نظریہ، جو کسی ملک کے زر کی بیرونی قیمت کو سکوں کی اندرونی قوت خرید پر مبنی بتاتا ہے اس لئے وجود میں آیا کہ پچھلی لڑائی کے بعد جب کہ سب ملک گولڈ اسٹینڈرڈ کو عارضی طور پر طے کر چکے تھے اور ہر ملک میں ایسے سکوں کا رواج تھا جو کسی دھات کے سکوں میں تبدیل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ سکوں کی بیرونی قیمت کے تعین کا

کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا، اور اس کمی کا پورا کرنا ضروری تھا۔ پروفیسر کیسل کی رائے کو جو اس نظریہ کا بانی سمجھے جاتے ہیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ "سکوں کی بیرونی قیمت کو عام حالات میں مختلف ملکوں کے سکوں کی اندرونی قوت خرید کے حساب سے متعین ہونا چاہیے"۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے فوراً بعد کے زمانے میں پروفیسر کیسل کی یہ رائے خاص مقبول ہوئی تھی، ان کے نظریئے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ اگر دو ملکوں میں کسی ایک سکے کی اندرونی قوت خرید میں کمی ہو جائے تو اس کے ساتھ لازمی طور پر اس کے سکے کی بیرونی قیمت میں کمی ہونی چاہیے اور ہوگی۔ مثلاً اگر کسی ملک میں قیمتوں میں ۱۰۰ فیصدی کا اضافہ ہو (یعنی زر کی قوت خرید میں کمی ہو جائے) اور باقی کسی اور ملک میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے سکے کی بیرونی قیمت آدھی ہو جائے گی۔ پروفیسر کیسل نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ قیمتوں میں تبدیلیاں ہی زر کی بیرونی قیمت میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہیں۔ زر کی بیرونی قیمت میں ردوبدل سے قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

اس نظریئے کو مان لینے میں بڑی دشواریاں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی صحت کی بنیادی شرط یہ معلوم ہوتی ہے کہ بین الاقوامی تجارت پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ کیونکہ اگر بیرونی تجارت پر پابندیاں ہوں تو اس نظریئے کی اور کمزوریوں سے قطع نظر (جن سے ہم ابھی بحث کریں گے) اس کی کارکردگی دشوار ہو جائے گی۔ مثلاً اگر کوئی ملک کسی

اور ملک سے درآمد کی چیزوں کی قیمتوں کی کمی کی تلافی اس طرح کر دے کہ اس پر بہت بھاری محصول لگا دے تو اس کی درآمد بند ہو جائے گی۔ اگر سب ملک یکساں پابندیاں لگائیں تو ظاہر ہے اس سے کوئی خاص دقت نہیں پیدا ہو گی، لاگت کا فرق، بعض چیزوں کو سستا بنا پانا اب بھی ممکن ہو گا۔ لیکن اگر یہ پابندیاں ایک طرح کی نہ ہوں تو اس طرح بیرونی زر کے بازار میں کسی ملک کے سکے کی رسد اور طلب کو مصنوعی طور پر متاثر کیا جا سکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ بالکل ممکن ہو گا کہ زر کی بیرونی قیمت اس سے مختلف ہو جو عام حالات میں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ صحیح بھی ہو کہ مختلف ممالک کے سکوں کی بیرونی قیمت ان کی اندرونی قوت خرید کے تناسب سے ہوتی ہے تو اس بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس رجحان کے اثر کو تجارت پر پابندیوں کے ذریعہ زائل کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسکے جواب میں یہ کہا جائے کہ تجارت پر پابندی کا کھیل سب ہی کھیل سکتے ہیں اس لئے اس کا امکان نہیں کہ کوئی ایک ملک اس امکان سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گا۔ لیکن تاریخ سے ایسی مثال مل سکتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صورت ممکن ہے۔ امریکہ نے تجارت پر پابندی کے ذریعہ مدتوں تک ڈالر کی قیمت کو اس طرح اپنے حق میں نفع مند رکھا ہے، ڈالر کو پونڈ سے بدل کر اس سے انگلستان میں چیزیں خریدنا زیادہ مفید تھا بہ نسبت اس کے کہ اس سے امریکہ ہی میں چیزیں خریدی جائیں۔

اسے چھوڑئے تو اس نظریے کے خلاف اور بنیادی اعتراضات

سامنے آتے ہیں سب سے پہلے تو قیمتوں کا مسئلہ ہے۔ اس نظریئے کے لحاظ سے کسی سکے کی بیرونی قیمت اس کی اندرونی قوت خرید کے تناسب سے ہوتی ہے لیکن یہ "قوت خرید" ہے کیا۔ زر کی قوت خرید کے تصور سے بحث کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ زر کی ایک یا عام قوتِ خرید کوئی معنی نہیں رکھتی، ہر الگ مقصد کے لئے ایک جداگانہ قوت خرید کا تصور زیادہ صحیح ہے۔ مثال کے طور پر یوں دیکھئے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بین الاقوامی تجارت ممکن ہے، بعض ایسی ہیں جن کی اس طرح تجارت ہو ہی نہیں سکتی۔ جہاں تک زر کی بیرونی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ محض اول الذکر کی لین دین کے سلسلے میں ہی پیش آسکتی ہے اور آتی ہے، اس کے برخلاف جن چیزوں کی لین دین ملک کی کسی سرحد کے اندر ہی محدود ہو اُن کا بیرونی زر کی مانگ یا رسد پر کوئی براہ راست اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے اگر ان دوسری قسم کی چیزوں کی قیمت میں کمی بیشی ہو بھی تو ان کا زر کی بیرونی قیمت پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑے گا، ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تجارت پر ایک اثر خود سکے کی بیرونی قیمت کا بھی پڑ سکتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔

اب اگر "قوت خرید" کا پتہ لگانے کے لئے ہم ان چیزوں کو ذہن میں رکھیں جو بیرونی تجارت میں آتی ہیں تو نظریہ کچھ معنی نہیں رکھتا کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کے مختلف بازاروں میں ان چیزوں کی قیمت ایک ہی ہوگی، مثلاً اگر روئی کا دام نیویارک میں اتنا کم ہو کہ اسے بمبئی منگا لیا جائے، اور

لانے کی لاگت دینے کے بعد بھی فائدہ کی گنجائش ہو تو لوگ یہی کریں گے۔ یہاں تک کہ دونوں مرکزوں میں روئی کا دام ایک ہی ہو جائے۔ ایسی چیزوں کی قیمتوں کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ سکّے کی بیرونی قیمت کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ کہ ان کے تعین کا سبب۔ اس کے برخلاف اگر ہم ان چیزوں کی قیمتوں کی مدد سے اس نظریئے کے لیے کارآمد "قوت خرید" معلوم کرنا چاہیں جن کی لین دین ملک کے اندر محدود ہوتی ہے تو نتیجہ اور بھی غیر تشفی بخش ہوگا۔ جیسا کہ کینس نے کہا ہے ایسا کرنے کے لئے ہمیں یہ مان لینا ہوگا کہ " آخر کار ان چیزوں کی قیمتیں جن کی لین دین کسی ملک کی سرحدوں کے اندر ہی محدود رہتی ہے اسی تناسب سے بدلتی ہیں جیسے ان چیزوں کی قیمتیں جن کی تجارت اس طرح محدود نہیں ہوتی "۔ اگر کسی ملک کی بیرونی تجارت معیشت میں زیادہ اہمیت رکھتی ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس حصے کی قیمتوں میں کمی بیشی سے معیشت کے دوسرے حصے بھی اسی طرح متاثر ہوں۔ اس کے برخلاف اگر بیرونی تجارت اتنی اہم نہ ہو تو یہ امکان اتنا ہی کم ہوگا۔ لیکن کسی بھی حالت میں یہ سمجھ لینا کہ دونوں کی قیمتوں کی تبدیلی ایک ہی ہوگی بالکل من گھڑت سی بات ہوگی، کیونکہ قیمتوں کا تعین جن بنیادی اسباب کی بدولت ہوتا ہے وہ سب چیزوں پر ایک ہی طرح اثرانداز ہوں یہ ضروری نہیں، بلکہ قرین قیاس بھی نہیں۔ اس لئے اس نظریئے کے لحاظ سے مفید " قوت خرید" کا پتہ لگانا ہی ناممکن نہیں تو بہت دشوار کام ہے۔

ایک بات اور۔ اس نظریئے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود زر کی بیرونی

قیمت کا عام قیمتوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا یہ بات صحیح نہیں ہے، اس سے پہلے بیرونی تجارت کے سلسلے میں ایک جداگانہ نظریے کی ضرورت سے بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بات کہی ہو کہ زر کی بیرونی قیمت میں ردوبدل سے تجارت میں فائدہ اور نقصان ہو سکتا ہے۔ اب اس سوال پر تھوڑی سی اور گفتگو ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زر کی بیرونی قیمت میں تبدیلی سے تجارت پر یعنی درآمد اور برآمد پر اثر پڑتا ہے، لیکن اس راستے سے آگے چل کر پھر اندرونی قیمتیں بھی ناگزیر طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ ایک موٹی وجہ تو یہی ہے کہ سبھی قیمتوں کا آپس میں ایک خاص قسم کا رشتہ سا بن جاتا ہے، ایک چیز کی قیمت میں تبدیلی دوسری چیزوں کی قیمت پر اثر انداز ہوتی ہے، زر کی بیرونی قیمت میں تبدیلی کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ باہر سے آنے والی چیزوں کے دام پر اثر پڑے گا۔ اگر آپ کے ملک کے سکے کی بیرونی قیمت میں کمی کر دی جائے، جیسا کہ پچھلے سال دنیا کے بہت سے ملکوں کے سکوں کی بیرونی قیمت کے ساتھ ہوا بھی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باہر سے آنے والی چیزیں مہنگی ہو جائیں گی۔ چنانچہ پچھلے سال پونڈ کی بیرونی قیمت میں کمی کی بدولت باہر کی چیزیں انگلستان کو بہت مہنگی پڑ رہی ہیں۔ پورے سال کی تجارت کے متعلق جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ خام اشیاء کی درآمد میں مقدار کے لحاظ سے تو پانچ فیصدی کا اضافہ ہوا لیکن قیمتوں میں کوئی ۳۰ فیصدی کا اضافہ ہو گیا ہے اسی طرح ہمیں باہر سے یعنی ڈالر کے علاقے سے آنے والی چیزیں مہنگی پڑنے

لگی ہیں۔ کیونکہ روپے کی بیرونی قیمت ڈالر کے مقابلے میں کم کردی گئی تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اناج کی خاص طور سے کمی ہو گئی ہے کیونکہ مختلف وجوہ سے کوئی ۶ لاکھ ٹن اناج ضائع ہو گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے امریکہ سے اناج منگانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ روپے کی بیرونی قیمت میں کمی سے یہ اناج ہمیں خاص طور پر مہنگا پڑے گا۔ اس لئے بعض حلقوں میں بجا طور پر اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں ایسے ملکوں سے اناج منگانے کی کوششیں کرنی چاہئیں جہاں سے ہمیں اناج بہت مہنگا نہ پڑے۔ اس سلسلے میں یہ خبریں بارہا سننے میں آئی ہیں کہ روس سے ہمیں اناج کافی مقدار میں اور بہت مناسب داموں پر مل سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت ہند روس سے تجارت بڑھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔ اسی طرح چین سے چاول ملنے کے امکانات بتائے جاتے ہیں لیکن ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں ہوئی ہے لیکن یہ بات تو برسبیل تذکرہ آگئی۔ ہمارا مقصد تو اس بات کی وضاحت ہے تھا کہ سکے کی بیرونی اور اندرونی قیمت ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں کہی جا سکتیں۔ اور بیرونی قیمت میں کمی بیشی کا لازمی طور پر اندرون ملک کی قیمتوں پر اثر پڑے گا۔ اور اس لئے زر کی اندرونی قوت خرید خود جس پر ہم بیرونی قوت خرید کو بھی سمجھتے ہیں موخر الذکر سے متاثر ہوتی ہے اس نظریے کے خلاف ایک بنیادی اعتراض اور بھی ہے۔ دو ملکوں کے سکوں کی باہمی قیمت پر ہر اس چیز کا اثر پڑے گا جس کی بدولت دونوں کی

ایک دوسرے سے تجارت کے سلسلے میں چیزوں کی طلب و رسد پر کوئی اثر پڑے ہے۔ قوت خرید کے مساوات کا یہ نظریہ جس میں قیمتوں میں ردو بدل کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے ایسے بہت سے اثرات کو جو چیزوں کی طلب میں ردو بدل پیدا کر سکتے ہیں یکسر نظر انداز کر دیتا ہے اس کے لحاظ سے تو طلب گویا صرف قیمتوں سے ہی متاثر ہوتی ہے۔ مجموعی طلب میں ردو بدل جو تجارتی مد جزر کی بدولت پیدا ہو جاتا ہے وہ اس نظریہ کے تحت گویا آتا ہی نہیں ہے۔ اس راستے سے چیزوں کی درآمد و برآمد پر جو اثر پڑ سکتا ہے اس کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے قوت خرید کے مساوات کے نظریئے کی مدد سے مختلف سکوں کی باہمی قیمت کا تعین بہت غیر تشفی بخش ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قومی آمدنی، مجموعی صرف اور روزگار کی مقدار میں ردو بدل ایسے اہم عناصر ہیں کہ انہیں نظر انداز کر کے سکوں کی باہمی قیمت کے تعین کی کوشش اگر یکسر فضول نہیں تو بہت زیادہ مفید بھی نہیں کہی جا سکتی۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قوت خرید کی مساوات کے نظریئے کی مدد سے ہم متوازن شرح مبادلہ کا پتہ نہیں لگا سکتے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ نظریہ بالکل بے کار ہے بعض صورتوں میں ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی نشان راہ ہی نہ ہو۔ نظری اعتراضات کے باوجود اس نظریہ کی افادیت بہت ہے کیونکہ ان حالات میں اس نظریئے کی مدد سے کچھ اندازہ تو ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ دو سکوں کی باہمی قیمت کیا ہوگی۔

اوپر ہم نے کہا تھا کہ متوازن شرح مبادلہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے برآمد تجارت کو کوئی مصنوعی فائدے نہ پہونچیں۔ اس کی روشنی میں ہم کسی ملک کی درآمد اور برآمد تجارت پر نظر رکھیں تو کیا اس طرح متوازن شرح مبادلے کا پتہ لگانے میں مدد نہیں ملے گی؟ دوسرے الفاظ میں اگر مختلف ملکوں کی برآمد تجارت پر توجہ دیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس تجارت کو فروغ دینے کے لئے کوئی مصنوعی ذرائع تو استعمال نہیں ہو رہے ہیں تو کیا اس سے ہمیں مختلف سکوں کی بیرونی قیمت کے تعین میں مدد نہیں ملے گی، اس میں مشکل یہ ہے کہ یہ صورت، مرض کی تشخیص کی نوعیت رکھتی ہے بچاؤ کی نہیں، دوسرے الفاظ میں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ بڑی چھان بین کے بعد یہ پتہ لگا لیں کہ کسی ملک کی برآمد تجارت کے فروغ میں اس بات کا بڑا دخل ہے کہ اس نے اپنے سکہ کی بیرونی قیمت کم کر رکھی ہے، لیکن درآمد اور برآمد پر اتنے ان گنت اثرات کام کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ کہ ان میں سب سے اہم عنصر کون سا ہے ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور اگر کسی ملک کے سکے کی بیرونی قیمت متوازن شرح سے تھوڑی سی کم یا زیادہ ہو تو درآمد اور برآمد تجارت کی مدد سے اس کا پتہ لگانا ناممکن ہوگا۔ مثال کے طور پر پچھلے سال دنیا کے بہت سے ملکوں نے ڈالر کے مقابلے میں اپنے سکوں کی قیمت میں کمی کی۔ لڑائی کے بعد سے انگلستان کی درآمد اور برآمد تجارت بہت ہی غیر متوازن رہی ہے، برآمد کم اور درآمد زیادہ، پونڈ کی قیمت میں کمی کا مطالبہ اس لئے زیادہ شدت پا گیا کہ اس سے کچھ قبل

امریکہ میں کساد بازاری کے بعض آثار پیدا ہو گئے تھے، اور اس کی بدولت مختلف خام اشیاء کی قیمت میں بہت کمی ہو گئی۔ اس طرح اسٹرلنگ علاقے کی چیزیں جو امریکہ خریدتا تھا اُن کے دام میں بہت کمی ہو گئی اور انگلستان کی تجارت کا عدم توازن اور بھی نمایاں ہو گیا، امریکہ نے دباؤ ڈالا کہ یہ عدم توازن اس بات کا نتیجہ ہے کہ پونڈ کی قیمت متوازی نہیں، بہت زیادہ ہے، اور انگلستان کو اس دباؤ کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کیونکر ہو کہ اس عدم توازن کی ذمہ داری امریکہ کی کساد بازاری پر تھی، یا پونڈ کی قیمت پر ؟ اس جملۂ معترضہ سے مطلب اس بحث میں پڑنا نہیں، بس صرف یہ ہے کہ اس سلسلے کی دقت کو اجاگر کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں اخبارات میں بارہا آپ نے یہ ذکر پڑھا ہو گا کہ انگلستان میں بیرونی سکوں (یا سونے) کے اثاثے میں بہت کمی (یا اب اضافے کی خبریں بھی آئی ہیں) ہو گئی ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی ملک کے پاس بیرونی سکوں (یا سونے) کا جو اثاثہ ہوتا ہے اس میں کمی یا زیادتی ہو رہی ہو تو اسے اس کے سکے کی قیمت کے عدم متوازن ہونے کی نشانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کا ملک سونا باہر بھیجنے پر مجبور ہو گیا ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ نکلتا ہے کہ آپ کے سکے کی مانگ کم اور بیرونی سکوں کی مانگ زیادہ ہے، اور اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے آپ کو اپنے ذخیرے میں سے رقم مہیا کرنی

ہوتی ہے۔ اگر شرح مبادلہ میں آزادانہ ردوبدل ممکن ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آپ کو دوسرے ملکوں کے سکے حاصل کرنے کے لیے زیادہ قیمت دینی پڑتی اور آپ کے سکے کی بیرونی قیمت کم ہو جاتی۔

بعض لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ اس طرح کسی ملک کے بیرونی سکوں کے ذخیرے میں کمی یا زیادتی کو اس کے سکے کی بیرونی قیمت کے غیر متوازن ہونے کی نشانی سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ رائے مان لی جائے تو اس اثاثے میں کمی یا زیادتی دونوں ہی صورت میں سکے کی بیرونی قیمت میں ردوبدل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ یہ بھی پوری طرح تشفی بخش حل نہیں ہے۔ سب سے پہلی دقت تو یہ ہے کہ غیر ملکی سکوں کے ذخیرے کی "مناسب" مقدار کا تعین ہی بہت دشوار ہے، اور اگر یہ مناسب مقدار متعین نہ کی جا سکے تو ظاہر ہے اس میں ردوبدل کو عدم توازن کی نشانی بتانا تو اور بھی دشوار ہو جائے گا۔

لیکن فرض کیجیے کسی طرح ہم بیرونی زر کے اثاثے میں تبدیلی کے تصور کو نظری طور پر مکمل کر لیں، تو بھی ہماری دقتوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ان اثاثوں کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت انہیں استعمال کیا جائے۔ اس لیے اگر کبھی ان میں کمی ہونے لگے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ اثاثہ کتنے دنوں تک کام آنا چاہیئے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی ملک کی تجارت کا انداز یہ ہو کہ پہلے چھ مہینے میں اس کی درآمد تجارت زیادہ ہو اور اس لیے اس کے بیرونی زر کے اثاثے میں کمی ہو، لیکن اس کے بعد دوسرے چھ مہینے میں یہ صورت بالکل بدل جائے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس بیرونی

زر کا اثاثہ ایسا ہونا چاہیئے کہ پہلے آدھے سال کی ضرورت کو پورا کر سکے، اور اس صورت میں یہ ذخیرہ سال بھر کے لئے کافی ہو جائے گا کیونکہ سال کے دوسرے نصف حصے میں اتنی ہی رقم واپس آ چکی ہوگی۔ اگر یہ اثاثہ نصف سال سے پہلے ہی ختم ہو جائے تو گویا شرح مبادلہ متوازن نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زر کا انتظام کرنے والوں کو کتنی مدت کے لئے سامان کرنا چاہیئے؟ پچھلی مثال میں ہم نے یہ دیکھا کہ ایک ضرورت تو گویا اتفاقی یا عارضی ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ہوگا، لیکن یہ کافی نہیں ہوگا کیونکہ تجارت میں کمی بیشی محض اسی لئے نہیں دوسرے اسباب کے بناء پر بھی ہو سکتی ہے۔ ایک بہت اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تجارتی مدوجزر کی بدولت درآمد اور برآمد تجارت کا نقشہ بدل جائے، بیرونی زر کے اثاثے کی مناسب مقدار کا تعین کرتے وقت اس قسم کی ضرورت کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اگر مختلف ملکوں کی معاشی حالت، یا تجارتی مدوجزر میں یکسانیت ہو، یا دوسرے الفاظ میں ہر جگہ خوش حالی اور کساد بازاری ایک ہی وقت آئے تو کسی کے لئے کوئی ایسی دقت نہیں پیدا ہوگی جو دوسروں کے سامنے نہ ہو، لیکن ایسا ہوتا نہیں، اس میں وقت اور شدت کا فرق مختلف ممالک کے مسائل کو مختلف بنا دیتا ہے۔ اور اس لئے ہر ملک کو اس کے لئے تیار رہنا ہوتا ہے کہ اس طرف سے جو بھی گڑبڑ پیدا ہو اس کے پاس اتنا اثاثہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔

پھر یہ بھی ہے کہ مناسب اثاثے کا تعلق اس سے بھی ہوتا ہے کہ کوئی ملک

اندرونی طور پر کسی قسم کی معاشی پالسی پر عمل کرتا ہے۔ اگر کوئی ملک یہ طے کرلے کہ اندرونی معاشی زندگی پر اس کا اثر کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ اپنے سکّے کی بیرونی قیمت میں استحکام قائم رکھے گا تو پھر وہ اپنے بیرونی زر کے اثاثے کو محفوظ رکھنے کا تقریباً بھرپور انتظام کرسکتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم نے گولڈ اسٹینڈرڈ سے بحث کرتے وقت بتایا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سکوں کی بیرونی قیمت مستحکم رہتی ہے۔ ایک بڑی طویل مدت تک اس اسٹینڈرڈ کی کارکردگی اس کا ثبوت ہے کہ اندرونی نتائج سے بے پروا ہو کر زر کی بیرونی قیمت کو مستحکم ۔۔۔ یا بیرونی زر کے اثاثے کو محفوظ ۔۔۔ رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں بیروزگاری کا مقابلہ مختلف حکومتوں کے مقاصد کا ایک بہت اہم جزو بن گیا ہے۔ اور اب کوئی بھی ملک زر کی بیرونی قیمت میں استحکام اس قیمت پر خریدنے کو تیار نہیں ہوگا کہ اس کے نتیجے کے طور پر ملک میں بے روزگاری پھیل جائے۔

یہاں ہمیں ایک اور نشان راہ ملتا ہے۔ بے روزگاری کی حالت سے ہم یہ طے کرسکتے ہیں کہ اندرونی معاشی زندگی متوازن ہے یا نہیں۔ کیا اس کی مدد سے سکوں کی بیرونی قیمت کے تعین میں بھی مدد لی جاسکتی ہے؟ لیکن اگر بے روزگاری کو ہم متوازن شرح مبادلہ کی نشانی سمجھنا چاہیں تو سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ بے روزگاری کی مقدار بذات خود یہ کام نہیں دے سکتی۔ بلکہ اس کی اضافی اہمیت ہمیں یہ پتہ دے سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم صرف یہ کہہ سکتے کہ چونکہ الف نامی ملک میں ب سے زیادہ یا کم

بیروزگاری ہے اس لیئے غالباً ان دونوں کے سکوں کی باہمی قیمت متوازن نہیں ہے۔ اگر بے روزگاری کو ہی عدم توازن کا نشان سمجھا جائے تو ہم اس عمل نتیجے پر پہونچیں گے کہ عالم گیر کساد بازاری کے ایام میں سبھی ملکوں کے سکوں کی بیرونی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ ایک ملک کے اندر روزگار کی حالت دوسرے ممالک کے مقابلے میں بہت خراب ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سکے کی بیرونی قیمت زیادہ ہے۔ لیکن ان حالات میں بھی علاج یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس سکے کی بیرونی قیمت میں کمی کر دی جائے۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو دوسرے ممالک سے بیرونی زر کھنچ کر اب اس ممالک میں آنا شروع ہوگا اور اگر تجارتی توازن کو سکوں کی بیرونی قیمت کے متوازن ہونے کا معیار سمجھا جائے تو ان دوسرے ممالک کے سکوں کی بیرونی قیمت گویا غیر متوازن ہو گئی۔

اس طویل گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ متوازن شرح مبادلہ کے تعین کیلیے ہم کوئی قطعی معیار نہیں قائم کر سکتے۔ لیکن اس تصور کی اہمیت بہت زیادہ ہے، خصوصاً موجودہ حالات میں جب سبھی ملکوں سے بیچ کا راستہ اختیار کرنیکا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک طرف معیار طلا کی خرابیوں کے تجربہ نے انھیں یہ سکھایا ہے کہ سکوں کی بیرونی قیمت میں استحکام ایسا مقصد نہیں کہ اس پر اور سب کچھ قربان کر دیا جائے، دوسری طرف سکوں کی بیرونی قیمت کو بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ اندیشہ بہت شدید ہے کہ اس طرح بین الاقوامی تجارت اور لین دین بُری طرح مجروح ہو جائیں گے۔

اس لئے متوازن شرح مبادلہ کی تلاش بہت اہم ہے، گو اس کی تعریف اور اس کا تعین کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا معیار یا پیمانہ نہیں جس سے ہم سکوں کی بیرونی قیمت کا توازن ناپ سکیں ایک حیثیت سے مفید ہے۔ اگر یہ نشان ایسا کھلا ہوا ہوتا کہ اس سے میں اور آپ بھی وقت سے پہلے معلوم کر لیتے کہ مثلاً روپے اور پونڈ کی قیمت متوازن نہیں تو یہ صورت اس عدم توازن کو اور بھی بڑھا سکتی تھی کیونکہ اس صورت میں ہونے والی تبدیلی سے فائدہ اٹھانے کے لئے لوگ سرمایہ منتقل کرنے لگیں گے اور اس طرح سکوں کی قیمت میں ردوبدل کا امکان اور بھی بڑھ جائے گا۔

اس باب کے شروع میں ہم نے دو سوالات اٹھائے تھے، ایک تو یہ کہ جب دو ملکوں کی باہمی تجارت میں عدم توازن پیدا ہو جائے تو اسے درست کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ابھی باقی ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابھی تک ایسے حالات میں کیا ہوتا تھا، کچھ پہلے تک تو سکے کی بیرونی قیمت میں ردوبدل بالکل ناجائز سمجھا جاتا تھا اور اس لئے عدم توازن کو درست کرنے کے لئے سارا بوجھ اندرونی قیمتوں، اور اندرونی معاشی زندگی پر پڑتا تھا، لیکن زیادہ تر کینس کے زیر اثر موجودہ رجحان یہ ہے کہ سکے کی بیرونی قیمت میں استحکام اتنا بلند مقصد نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے لئے اور سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ اب سکے کی بیرونی قیمت کو ثانوی اہمیت دی جاتی ہے، اندرونی

معاشی زندگی کا استحکام اولین مقصد سمجھا جاتا ہے، لیکن ان حالات میں عدم توازن کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ ایک جواب تو ہم نے اوپر متوازن شرح مبادلہ کے تصور کی مدد سے دینے کی کوشش کی ہے۔ دو سکوں کی باہمی قیمت غیر متوازن ہو جائے تو اسے بدل دینا چاہئے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ متوازن شرح مبادلہ کی ایسی توضیح ممکن نہیں کہ اس کا تعین کوئی آسان کام ہو۔ نظری طور پر ہم نے متوازن شرح مبادلہ کی تعریف کر دی ہے، ایسی شرح جس سے سب ملکوں کی باہمی لین دین توازن پیدا ہو جائے اور قائم رہے۔ کسی ایک ملک کے نقطۂ نظر کا خیال کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سکے کی وہ قیمت جو اس کے بیرونی لین دین میں توازن پیدا کر دے۔ اس سلسلے میں یہ ضروری نہیں کہ برآمد اور درآمد تجارت ہمیشہ بالکل برابر رہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ایک مناسب مدت ذہن میں رکھیں تو اس ملک کی لین دین میں توازن پیدا ہو جائے۔ اور نہ تو افراط زر کی خرابیاں پیدا ہوں، اور نہ زر کی کمی۔ دوسرے الفاظ میں نہ تو زر کی بیرونی قیمت کم ہو، اور نہ زیادہ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ علاج آسان نہیں۔ چنانچہ پہلی لڑائی کے بعد کی تاریخ شاہد ہے کہ بیرونی قیمت میں رد و بدل کے ذریعہ علاج کی ایک طرفہ کوشش کیسی خرابی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اس بات کی وضاحت سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ زیادہ برآمد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں روزگار میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے،

کسی وجہ سے ایسا ہو کہ امریکہ میں چیزوں کی خریداری میں کمی آجائے تو اس صورت کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ امریکی حکومت برآمد تجارت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ درآمد کو قابو میں رکھے۔ اب اگر ایسا ہو جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ برآمد کی بدولت ان چیزوں کی بکری بھی ممکن ہو جائے گی جن کی امریکہ میں اندرونی طور پر کسی وجہ سے (مثلاً عام بے روزگاری یا کساد بازاری) کم ہو گئی تھی اور چونکہ درآمد پر پابندی ہو گی اور اس میں زیادہ اضافہ نہیں ہو گا اس لئے ایک طرف تو ملک کی معاشی زندگی پر یوں اچھا اثر پڑے گا کہ برآمد کے لئے چیزیں تیار کرنے والی صنعتوں میں توسیع ہو گی اور روزگار میں اضافہ ہو گا۔ دوسری طرف برآمد سے حاصل شدہ آمدنی کی بدولت دوسری امریکی پیداوار کے لئے مانگ میں اضافہ ہو گا (اس سلسلے میں ہمیں ملٹی پلایر اثر کا خیال رکھنا چاہئے) چنانچہ اسی طرح کی توقعات کے تحت مختلف ملکوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کئی ایسے طریقے جن کا مقصد برآمد تجارت میں اضافہ اور درآمد میں کمی تھی، چنانچہ دوسرے ملکوں سے آنے والی چیزوں پر بھاری محصول لگائے گئے، سکے کی بیرونی قیمت میں کمی کی گئی، بین الاقوامی لین دین پر پابندیاں لگائی گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ درآمد کے لئے نت نئی پابندیاں، لائسنس اور جانے کیا کیا لگائی جائیں، اور برآمد تجارت کو مدد دینے کے لئے مالی امداد دی جا سکے۔ لیکن یہ بات صاف ہو گئی ہو گی کہ اس طرح ایک ملک کی

امیدیں اسی صورت سے پوری ہو سکتی تھیں جب دوسرے ملک
ان تمام اقدامات کے خلاف آواز نہ اٹھائیں، ظاہر ہے ایسا نہیں
ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس طرح کی ترکیبوں پر عمل عام ہو گیا اور اس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ بین الاقوامی لین دین میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی، تجارت کی
مقدار میں کمی ہو گئی، ایک دوسرے کو بے روزگاری کے غار میں ڈھکیلنے
کی کوشش میں سبھی ملک (بجز روس کے جہاں منصوبہ بندی شروع کی گئی،
اور اس طرح ترقی اور توسیع کی داغ بیل ڈالی جاسکی) بے روزگاری کا
شکار ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے تک اس صورت
حال سے پوری طرح چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکا تھا۔

لیکن اس تجربہ سے کم سے کم نظری طور پر تو سبھی ملکوں نے ایک
سبق سیکھا تھا، اور وہ یہ کہ مختلف ممالک کے باہمی تعاون اور اشتراک
عمل کے بغیر اس طرح کی دقتوں کا حل ممکن نہیں۔ اس احساس کی بدولت
دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی بین الاقوامی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا
جن کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ مختلف مسائل
میں مختلف قومیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل
کے ذریعہ ایک بہتر زندگی کی تعمیر کر سکیں، بین الاقوامی تعاون کے
ان اداروں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی کارکردگی بے عیب ہے۔
لیکن اشتراک عمل کا وہ تصور جو کم سے کم نظری طور پر ان کی پشت پر
کارفرما تھا وہ ضرور بے داغ ہے۔ یہاں ہمیں دوسرے اداروں سے

تو کوئی غرض نہیں، بین الاقوامی لین دین سے متعلق جو ادارے بنے ہیں ہمیں تو اُن سے ہی مطلب ہے، اس سلسلے میں بین الاقوامی تجارتی انجمن اور بین الاقوامی مالی فنڈ اہم ہیں، اول الذکر کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی تجارت کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کیا جائے، بیجا پابندیوں اور نامناسب رکاوٹوں کو ختم کر دیا جائے۔ بین الاقوامی فنڈ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ سکوں کی بیرونی قیمت میں یک طرفہ تبدیلیوں کو روکنے کی کوشش کی جائے اور ضرورت مند ملکوں کو مدد دے کر یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تجارت میں مناسب ذریعوں سے توازن پیدا کر لیں اور پہلی جنگ عظیم کے بعد کی تاریخ دہرائی نہ جائے۔ فنڈ کے دستور کی پہلی دفعہ کے مطابق اس کے مقاصد یہ ہیں :-

۱ - ایک مستقل ادارے کی مدد سے بین الاقوامی مالی اشتراک عمل کو ترقی دینا۔

۲ - بین الاقوامی تجارت کی توسیع، اور متوازن ترقی میں مدد دینا تاکہ اس طرح سب ممبر ملکوں میں روزگار میں توسیع ممکن ہو سکے۔

۳ - مبادلے میں استحکام قائم رکھنا مختلف ملکوں کے سکوں کی بیرونی قیمت میں مناسب تبدیلیوں کا انتظام کرنا، سکوں کی قیمت میں یک طرفہ تبدیلیوں کو روکنا۔

۴ - مناسب شرائط پر مختلف ملکوں کو ضرورت پڑنے پر مدد دینا تاکہ وہ تجارت کے عدم توازن کو مناسب طور پر ختم کر سکیں، او

اس طرح کا عدم توازن خود اس ملک کی یا بیرونی دنیا کی خوش حالی کو برباد نہ کر دے۔

ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ضرورت کے وقت فنڈ سکوں کی بیرونی قیمت میں تبدیلی کی اجازت دے گا، اس طرح یہ امکان کم ضرور ہو جاتا ہے کہ کوئی ملک یک طرفہ اس قسم کا فیصلہ کر کے دوسرے ملکوں کے لئے سکے کی قیمت میں تبدیلی کو ناگزیر بنا دے۔ اس کیلئے فنڈ کے قانون میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ بیرونی شرح مبادلے میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہوگی جب یہ قطعی طور پر ثابت ہو جائے کہ کسی ملک کی تجارت میں "بنیادی عدم توازن" پیدا ہو گیا ہے۔ اس بنیادی عدم توازن کی کوئی قطعی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے فنڈ کے قیام کے باوجود ہمارے سوال کا کہ عدم توازن کی شکل میں کیا کرنا چاہیئے مکمل جواب نہیں ملتا۔ یہ تو ہم نے سمجھ لیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اس سوال پر مزید بحث اس چھوٹی سی تمہیدی کتاب کے بس میں نہیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سوال کا حل آسان نہیں ہے۔ اس طرح کا عدم توازن کینس کے خیال میں بنیادی طور پر محض یوں ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ دو مختلف ملکوں میں قیمتوں اور اجرتوں کا رجحان جداگانہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں اگر ایک ملک میں معاشی توسیع ہو رہی ہو اور دوسرے کسی ملک میں کساد بازاری کے آثار پیدا ہو رہے ہوں تو ان دونوں کی تجارت میں عدم توازن خطرناک ہو گا۔ اور اس طرح کی صورت اگر پیدا ہو گئی تو

کیا ہوگا ؟ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ روزگار کی سطح کا اونچا رکھنا
کہ ہر شخص کو جو کام کرنا چاہے کام مل جائے، آنے والے سالوں ک
اہم ترین سوال ہے۔ اس کے حل پر اندرونی معاشی زندگی کا استحکا
منحصر ہے اور بیرونی تجارت کی توسیع و ترقی بھی۔ سرمایہ دار ملک
اس سوال کو حل کر سکیں گے، یا نہیں ؟ غالباً نہیں۔ جنگ کی ا
بڑے پیمانے پر تیاریاں معاشی "خوش حالی" کا فریب قائم رک
کے لئے ہی کی جا رہی ہیں، اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان حالات
میں بھی امن کے کام جو ریاست کر رہی ہے وہ محض سوویت یونین ا
اسی کی طرح کا نظام رکھنے والی عوامی جمہوریتیں ہی ہیں۔